...زی کے نمونے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔
گو ضرورت وقت اور تجارتی مصلحت کے تحت وہ انقلابی قدم نہ اٹھا سکے۔"

(بحوالہ: اردو ڈراما۔ تاریخ وتنقید۔ عشرت رحمانی۔ سن اشاعت: ۱۹[illegible]ء، صفحہ نمبر۔۳۰۸)

نورالحسن نقوی نے بھی حشر کے آخری زمانے کے ڈرامے "یہودی کی لڑکی" کا فنی جائزہ لیتے ہوئے ڈرامہ کی کشمکش اور کشاکش کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"ان کے ڈراموں کی بنیاد کشمکش پر ہوتی ہے۔ ڈرامائی عمل پلاٹ پر حاوی ہوتا ہے۔ پلاٹ عام طور پر سادہ ہوتے ہیں ایک بات یہ کہ آغا حشر اپنے ڈراموں میں شدید کشمکش دکھانے کے بعد آخر میں حق کی فتح اور باطل کی شکست دکھاتے ہیں آخر زمانے کے ڈراموں میں مثلاً یہودی کی لڑکی، آنکھ کا نشہ، دل کی پیاس میں اصلاحی مقصد اور زیادہ ہو گیا۔"

(بحوالہ: تاریخ ادب اردو۔ نورالحسن نقوی، ایڈیشن ۲۰۰۵ء، صفحہ نمبر۔۳۷۵)

ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے "یہودی کی لڑکی" کا فنی تجزیہ اور محاکمہ انتہائی خوبصورت اور بلیغ انداز میں کیا ہے۔ جس کی تفصیل میں یہاں جانے کی چنداں ضرورت نہیں پھر بھی مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکر و فن کے اعتبار سے آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ "یہودی کی لڑکی" ایک کامیاب کوشش ہے۔ جس کو نظر انداز کر کے اردو ڈرامہ نگاری کی کوئی بھی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اردو ڈرامہ نگاری کو آغا حشر کی یہ بے پناہ عطا ہے کہ آج تک اردو ڈرامہ نگاری کسی نہ کسی طور پر مستفید ہو رہی ہے۔

---

# شبلی کی اُردو شاعری


## پروفیسر محمد جعفر احراری ندوی

شعبۂ اردو، ذاکر حسین دہلی کالج (دہلی یونیورسٹی)


شبلی کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں تسنیم تخلص کیا۔ اس زمانے میں تسلیم لکھنوی کی بہت شہرت تھی غالباً اسی سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنا تخلص تسنیم رکھا ہوگا۔ شبلی پر ان کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری کا اثر پڑا جو شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ مولوی محمد عبداللہ جیراجپوری کا ایک بیان "حیات شبلی" میں اس طرح نقل کیا گیا ہے:

"مولوی عبداللہ صاحب بیان فرماتے ہیں کہ مولوی شبلی میں بچپن ہی سے آثار کمال پائے جاتے تھے۔ ایک رات کو میں سو رہا تھا قریب ایک بجے کا وقت تھا، یک بیک میری آنکھیں کھل گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا ایک "قطعۂ تاریخ" لکھ رہے ہیں حالاں کہ یہ ان کا بچپن تھا"۔ نمبر 44

شبلی نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا جو تا حیات جاری رہا۔ ان کے بالکل ابتدائی زمانے کے اشعار میں نہیں ملتے۔ اس کی وجہ سید صاحب نے لکھی ہے:

"مولانا کی شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ وہ شروع میں فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام کا... ابتدائی حصہ ایک بیاض میں جمع تھا۔ مولانا غازی پور میں ایک جلد ساز کو وہ بیاض جلد باندھنے کو دے آئے اور وہ وہاں سے غائب ہو گئی"۔ نمبر 45

اس بیاض کے غائب ہونے کے بعد انھوں نے ایک اور بیاض تیار کی تھی اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ شبلی مولوی سمیع کو اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"میری بیاض کا تقریباً آدھا حصہ چوری ہو گیا۔ نہایت افسوس ہے"۔ نمبر 46

شبلی کے اُردو کلام کو ہم دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی 1883 سے پہلے کا زمانہ ہے جس میں صرف چند اشعار دستیاب ہیں اور جنھیں کلیات میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ دوسرا 1883 سے 1914 تک کا زمانہ۔ اس عہد کا کلام کلیات کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ 83 اور 84 میں کہی جانے والی غزلوں میں شاعری کی قدیم روایات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ تغزل کا رچا ہوا اسلوب، معاملہ بندی، شوخی، خیال بندی، خودسپردگی کا اظہار جا بجا ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دو قدم چل کر ترے وحشی کے ساتھ　　جادۂ راہِ بیاباں رہ گیا

# شبلی کا سرمایہ فکر و دانش


## پروفیسر محمد جعفر احراری ندوی

شعبۂ اردو ذاکر حسین کالج (دہلی یونیورسٹی)


مذاقِ تحقیق اور ذوقِ جمال شبلی کے ادبی مزاج کے عناصر ترکیبی ہیں۔ وہ ہمیشہ علمی مآخذ کی جستجو میں سرگرداں رہتے اور عربی، فارسی، انگریزی، جرمن اور فرانسیسی جیسی زبانوں کی علمی کاوشوں سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ یورپین زبانوں سے واقفیت کو شبلی اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مستشرقین کے اعتراضات اور ان کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کو سمجھا جاسکے اور ان کا معقول اور مدلل جواب دیا جاسکے۔ ساتھ ہی تحقیق کے نئے انداز سے مکمل آگاہی بھی ہو۔ وہ سرسیّد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''زبان کی اجنبیت کی وجہ سے حالات معلوم کرنے میں نہایت دقت ہوتی ہے۔ میں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے اور انشاء اللہ کچھ نہ کچھ بقدرِ ضرورت واپسی کے وقت تک سیکھ لوں گا''۔

مولانا کو جس زبان سے واقفیت نہ ہوتی تو اس کا ترجمہ کراتے اور اپنے کام کی چیز کو لے لیتے۔ وہ مآخذ کی تلاش و تحقیق اور تنقید کو تحقیقی کاموں کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ روم، مصر، فارس اور شام کا سفر بھی انھوں نے اپنی علمی سرگرمیوں کی خاطر کیا۔ ''کسوف الشمسین'' میں شبلی کی علمی و فکری سرگرمیوں کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

> ''شکستہ پا مصنف ایک ایک واقعے کی چھان بین کے لیے کبھی لکھنؤ ہوتا تھا اور کبھی کلکتہ کے لیے بادیہ پیما۔ کبھی مطبوعاتِ جدیدہ کی کھوج میں بمبئی پہنچتا تھا اور معاً کتبِ قدیمہ کی تلاش میں کبھی مشرق میں بانکی پور کا، کبھی جنوب میں حیدرآباد کا رُخ کرتا تھا۔ ضعیف البصر مصنف ایک بوریے پر اس طرح آرام کرتا تھا کہ داہنے بائیں، سرہانے پایانتی کتابوں کا انبار ہوتا تھا۔ بوسیدہ اور کرم خوردہ اوراق اس کے ہاتھ میں ہوتے تھے''۔

شبلی کا ذوقِ جمال ان کے رگ و پے میں ساری تھا۔ ان کا مزاج اس درجہ رومانی تھا کہ ان کی صلاحیتوں میں اس سے حرکت پیدا ہوتی تھی اور وہ کچھ دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتے تھے۔ مولانا کی فارسی غزلوں میں ان کے ذوقِ جمال کا اظہار خوب خوب ہوا ہے۔

شبلی نے اپنی علمی و فکری سطح کو بلند کرنے کے لیے مشرق و مغرب کے علمی خزانوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ اگرچہ انھوں نے قدیم مشرقی انداز کے مطابق علوم حاصل کیے لیکن ان علوم میں انھیں جو کوتاہیاں نظر آئیں وہ انھیں بار بار مغرب کی جانب متوجہ کرتی تھیں۔ انھوں نے مغرب سے تحقیق اور تنقید کا طرز حاصل کیا اور اپنی دید و دانش سے اسے اور بھی دلکش بنا دیا۔ مولانا مغرب کی تحقیق کی خوبی اور خامی دونوں سے باخبر تھے، اسی لیے مشرقی اور مغربی دونوں مآخذ پر ان کی تنقیدی نگاہ رہتی تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے، ان کے ایک ایک حرف کے لیے سینکڑوں ورق الٹنے پڑتے ہیں۔ یہ کم بخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے۔ یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کی ہیں''۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ شبلی کے سرمایۂ فکر و دانش اور تحقیق و تنقید کے شعور میں بہت حد تک سرسیّد کے فیضِ صحبت کا اثر تھا۔ سرسیّد غالباً پہلے مسلمان مفکر تھے جنھوں نے انگلستان کے کتب خانوں میں بیٹھ کر عیسائی مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اسلامیات سے متعلق ان کے نظریات سے باخبر ہوئے۔ یہ ایک ایسا جرأت مندانہ قدم تھا جس سے شبلی اور دوسرے مصنفین میں عزم و حوصلہ پیدا ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ شبلی کی ساری دماغی تربیت سرسیّد کے زیرِ اثر ہوئی۔ سرسیّد کا کتب خانہ جو یورپ اور مصر کی جدید کتابوں سے بھرا ہوا تھا، شبلی وہاں الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہتے اور کتابوں کا جائزہ لیتے۔ انھیں علی گڑھ میں مشہور انگریز پروفیسر آرنلڈ مل گئے، مولانا نے ان سے فرنچ سیکھی اور انھیں اپنا استاد بنا لیا۔ ''کسوف الشمسین'' میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

> ''بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست استاد کالج میں تھا۔ یہ دونوں دلدادگانِ علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول

# اردو کا خاموش خادم: سیّد نیاز احمد

## پروفیسر محمد جعفر احراری ندوی
شعبۂ اردو، ذاکر حسین دہلی کالج (دہلی یونیورسٹی، دہلی)

نیاز صاحب کو ایک فرد یا شخص کے طور پر کوئی بھی نظر انداز نہیں کرسکتا۔ چہرے بشرے سے وہ خود اپنی پہچان بنالیتے ہیں۔ میرے تعلقات کی عمر بمشکل دس برس ہے۔ 'سر' سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنی عمر کی پانچویں دہائی کا سفر طے کر رہے تھے اور شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج کے صدر تھے۔ اس سے قبل جب وہ کالج میں عنفوان شباب کی منازل طے کر رہے تھے تو ہر ایک ان کے کتابی چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتا اور جیسا کہ سننے میں آیا کہ ان کی روشن آنکھوں میں اپنے خوابوں کی جگمگاہٹ کو دیکھنے کی سعی جاری رہتی، اس سلسلے میں ان کی شاگردہ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ نے اپنے مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''نیاز صاحب بڑی دلکش، وجیہ اور پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا جمالیاتی ذوق ان کی ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے۔ بڑے نفاست پسند ہیں۔ حسین چیزوں کی بلا مبالغہ تعریف کرتے ہیں۔ اچھے کھانوں کے شوقین ہیں۔ رکھ رکھاؤ والے آدمی ہیں۔''

مقبولیت ہو یا شہرت وہ انسان کا فطری ضعف ہے ایسی صورت میں فرد عموماً زمینی رشتوں سے اپنا ناطہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر توڑ لیتا ہے مگر علم کے ساتھ اگر ذوق سلیم ہو تو فرد ایک ایسی متوازن زندگی بسر کرتا ہے جو اس کے اور دوسروں کے درمیان ایک پائدار اخوت ورواداری کے رشتوں کو استوار کردیتا ہے۔ غالباً علم اور صحیح ذوق کا امتزاج 'سر' کی فطرت میں شامل ہوگیا۔ اس انداز خاص کو جاننے کے سلسلے میں میرے جذبۂ تجسس نے ان کے ماضی کے اوراق پڑھنے اور جاننے کی کوشش کی۔ گاہ گاہ مختلف چھوٹی بڑی نشستوں میں ان کے خاندانی سلسلے، تعلیم، مصروفیات وغیرہ پر کبھی بالواسطہ اور بلاواسطہ گفتگو ہوتی رہی۔ میرے اس استفسار پر کہ آپ کا تعلق تو خانوادۂ سادات سے ہے کچھ اس بارے میں معلومات بہم پہنچائیں تو انھوں نے مسکراتے ہوئے میر کا یہ مصرعہ گوش گزار کردیا:

کیا بودوباش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!

فرمایا بھئی اب تو سر پر پگڑی نہیں ہے ورنہ سنبھال کر چلنا پڑتا۔ ہمارے چچا زاد بھائی سیّد انور حسین صاحب مرحوم نے اپنے بیٹے کے نام سے 'سیّد' کا لفظ ہائی اسکول کے بعد ہٹوا دیا کہ ہر کس وناکس نے بقول مرزا غالب:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

غلام احمد فرقت کاکوروی مرحوم جو اردو کے بلند پایہ مزاح اور طنز نگار اور اینگلو عربک اسکول میں تاریخ کے استاد تھے، نے نیاز صاحب کی بہت مدد کی۔

دوسرے وہ اہل قلم جس سے 'سر' کا رشتہ محض ان کے ناولوں کے ذریعے تھا اور وہ اس دور میں ابن صفی کے نام سے معروف ومشہور تھے جن کے جاسوسی ناول مارکیٹ میں آتے ہی غائب ہوجایا کرتے تھے۔ 'سر' کے بموجب یہ دو حضرات ہیں جو ان کی اردو زبان وادب سے دلچسپی اور ذوق وشوق کے محرک بنے۔ حسنِ اتفاق سے فرسٹ ایئر کے امتحان میں اردو کے پرچے میں کلاس میں سب سے زیادہ نمبر 76 فیصد حاصل کیے۔ اس وقت دہلی کالج شعبۂ اردو کے صدر شیو پرشاد وسشٹ جاوید نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ اردو آنرز میں داخلہ لیں۔ چناں چہ ان کی تعلیم کی گاڑی نے اپنی پٹری بدلی اور اردو زبان وادب کے طالب علم بن گئے۔ بی اے آنرز میں فرسٹ ڈویژن اور سکنڈ پوزیشن یونیورسٹی میں حاصل کی۔ اس دوران کالج کی دیگر کلچرل سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ این سی سی میں آرمڈ اسکوائڈ کی طرف سے الور میں کیمپ میں شامل ہوئے۔ ایمولنس اور سوشل سروس لیگ کے سرگرم رُکن رہے۔ آرٹس اینڈ کلچر سوسائٹی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ شعبۂ اردو کی بزم ادب کلچرل سوسائٹی میں بحیثیت سکریٹری ذمہ داری سنبھالی اور کالج اردو میگزین کے مدیر رہے۔ دہلی یونیورسٹی کے سپریم کونسلر کے انتخابات میں منتخب کیے گئے۔ زبان وادب کی دلچسپیوں کے ساتھ اپنی چشم کو ہر رنگ میں وا ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ ہندی اور انگریزی فلموں کا خاص شوق رہا اور اردو ہندی کے کلاسیکل ادب کے ساتھ انگریزی فکشن اور نفسیات وفلسفے، تاریخ وعمرانیات کا خصوصی شغف رہا۔ 'سر' بیدار ذہن اور زندہ دل کے مالک ہیں۔ اپنی خوش ذوقی اور جمالیاتی حس کی چھاپ ان کے وجود میں نظر آتی ہے۔ والد صاحب اپنی ملازمت کے سلسلے میں دہلی ہیڈ کوارٹر سے منتقل ہوکر بامبے اسٹیٹ (جو مہاراشٹر اور گجرات پر مشتمل تھا) مہاراشٹر میں اپنی ملازمت کو جاری رکھا اور مرزا محمود بیگ صاحب کے مشورے کے بموجب ان کی بڑی ہمشیرہ ڈاکٹر سیّدہ افسری افتخار مرحومہ اور نیاز صاحب کو مزید تعلیم جاری رکھنے کے لیے ان کی نگرانی میں دلّی چھوڑ دیا۔ شروع کے ایک برس کرشچین فیملی فرینڈ کے یہاں قیام پذیر رہے اس کے بعد دہلی کالج ہوسٹل میں وارڈن شمن صاحب مرحوم جو نفسیات کے لکچرر تھے، کے ہمراہ قیام کیا لیکن جلد ہی ہوسٹل کے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہوئے جیسا کہ سننے میں آیا ہے کہ وہ کمرہ ایک چنڈورہ ہاؤس کی طرح تھا جس میں ضرورت کا ہر سامان بڑے سلیقے کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ اس میں چار افراد کے سونے کے امکانات ریلوے کمپارٹمنٹ کی فرسٹ کلاس کو پے کی

# سیّد سلیمان ندوی


## پروفیسر محمد جعفر احراری ندوی

شعبۂ اردو ذاکر حسین دہلی کالج

(دہلی یونیورسٹی)


مولانا سید سلیمان ندوی دبستان شبلی کے گل سرسبد ہیں۔ ان کی تحریروں پر سب سے پہلا اثر مولانا عبدالحلیم شرر کا ہے جیسا کہ خود انھوں نے اس کی تصریح کی ہے۔ کہیں کہیں وہ محمد حسین آزاد کے طرز کو بھی جگہ دیتے رہے ہیں لیکن یہ دونوں طرز تحریر عارضی تھے۔ سید صاحب ابوالکلام آزاد اور شبلی کے طرز سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے ابوالکلام آزاد کے خطیبانہ اور پر جوش اسلوب کو اتنی خوب صورتی سے نبھایا ہے کہ ان پر بوکلامیت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ سید صاحب نے آخر میں اپنے استاد شبلی کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا اور یہ اس لیے بھی تھا کہ ان کی علمی و ادبی تربیت زیادہ تر شبلی ہی کے زیر سایہ ہوئی۔ سید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں خود اس بات کی وضاحت کردی ہے چنانچہ عبدالحلیم شرر اور آزاد کے اسلوب سے وقتی اور عارضی طور پر متاثر ہونے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ناچار ادھر سے ہٹ کر پھر استاد کی بتائی ہوئی شاہ راہ پر آنا پڑا کیوں کہ علمی مضامین کے لیے ان کے طرز تحریر سے بڑھ کر کوئی دوسرا طرز کارآمد نہیں، اس لیے بار بار ان سے اصلاحیں لیں۔ ان کی ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی اور سالہا سال ان کی صحبت اٹھائی تو علمی زندگی کا ایک نہج تقریر کا ایک طرز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا''۔

سید صاحب کی دوسری کتابوں میں بھی شبلی کے طرز نگارش کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ کسی بات کی اہمیت وعظمت ظاہر کرنے اور زور دینے کے لیے شاعرانہ خیال کا استعمال کرتے ہیں۔ وثوق و اعتماد اور احساس عظمت و کمال کی بھی کمی نہیں۔ سید صاحب کے یہاں فارسی کی شگفتہ تراکیب کا استعمال تو ہوا ہے لیکن عربیت کی مہارت اور میلان کے سبب ان کا رنگ شبلی سے کچھ مختلف نظر آتا ہے۔ شبلی کی نثر کا ایک خاص رنگ طنز ہے۔ سید صاحب بہت حد تک اس سے متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنی تحریروں میں اسے نبھانے کی کوشش بھی کی ہے لیکن یہ صفت ان کی طبیعت کے میلان سے ہم آہنگ نظر نہیں آتی یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کے یہاں طنز کا استعمال کم ہوا ہے۔ شبلی کی طرح ان کے یہاں طنز میں تیکھا پن اور بے ساختہ پن نہیں ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ سید صاحب نے شبلی کے اسلوب کو اختیار کیا لیکن یہ محض خارجی عوارض ہیں ورنہ داخلی طور پر وہ شبلی سے الگ نظر آتے ہیں مثلاً شبلی کے مزاج میں جوش وخروش تھا لیکن سید صاحب کے مزاج میں متانت تھی، جو ان کے اسلوب سے بھی جھلکتا ہے۔ سید صاحب خشک سے خشک موضوعات کو دلچسپ بنادیتے ہیں۔ پر وقار اور متین لہجہ ان کے انفرادی اسلوب پر دلالت کرتا ہے۔ توازن و شگفتگی، دلکشی اور فصاحت کا وہ ساتھ نہیں چھوڑتے۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی اپنی کتاب میں سید صاحب اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سید صاحب جب خالص ادبی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر طاؤس بن کر رقص کرتا ہے۔ اس وقت سید صاحب اردوئے معلی کی شستہ، شیریں اور دلآویز زبان کی موجیں بہاتے ہیں۔ عبارت میں تشبیہ، ترکیب لفظی، مناسبت معنوی اور رعایت تجنیس کے حسن سے رنگ آمیزی کے عناصر سمودیتے ہیں، جس سے غرض یا تو کسی مسئلے کی تفہیم ہوتی ہے یا حسن ادا کا بانکپن یا ایجاز و اختصار کے ساتھ ایک وسیع بحث کو دل نشین پیرایے میں ادا کرنے کا خیال۔ لیکن بایں ہمہ یہ امر خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھنے کے لائق ہے کہ سید صاحب کے مزاج کا بنیادی وصف اعتدال و توازن حسن انشاء کی قربان گاہ پر بھی بھینٹ نہیں چڑھ سکا ہے۔ ان کے اشہب قلم کے قدم بھی جادۂ اعتدال سے لغزش نہیں کر سکے ہیں''۔

سید صاحب نے بہت سی علمی، ادبی اور مذہبی کتابیں تصنیف کیں، جن میں ارض القرآن، سیرت النبی، سیرت عائشہ، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، خیام، رحمت عالم، حیات شبلی قابل ذکر ہیں۔

دکن کالج پونا کے زمانہ قیام میں سید صاحب نے ''ارض القرآن'' کی تصنیف کا آغاز کیا تھا۔ اس میں قدیم عرب کے جغرافیہ، عرب اقوام کی قدیم مذہبی و تمدنی تاریخ پر محققانہ اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دراصل یہ ''سیرت النبی'' کا مقدمہ تھا جیسا کہ شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے:

''یہ درحقیقت سیرت النبی جلد اول کا مقدمہ ہے مگر چوں کہ یہ زیادہ طویل ہو گیا اس لیے اس کا صرف خلاصہ سیرت میں لیا گیا ہے''۔

اس کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد 1917 اور دوسری جلد 1918 میں دارالمصنفین سے شائع ہوئی۔

# سبق اردو

مئی ۲۰۲۲ء


| | | |
|---|---|---|
| ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: ڈاکٹر محمد سلیم | سرنامہ: عادل منصوری | جلد: ۷ — شمارہ: ۵ |
| موبائل: 9696486386 | سرورق: دانش الہ آبادی | Net Banking:SABAQ -E-URDU( MONTHLY) |
| واٹس ایپ: 9919142411 | کمپوزنگ: دانش الہ آبادی، دانش قلم | IFSC BARB 0 GOPI BS A/C28240200000214 |
| sabaqeurdu@gmail.com | مطبع: عظیم انڈیا پریس، گوپی گنج، بھدوہی | Bank of Baroda, Branch: Gopiganj |
| فی شمارہ: -/100، زرتعاون: -/1000 | زرتعاون خاص: -/2000، اعزازی تعاون: -/5000 | Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA |



کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کی سنوائی صرف ضلع بھدوہی کی عدالت میں ہوگی۔ ادارہ



چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر دانش الہ آبادی



| | | |
|---|---|---|
| پروفیسر محمد جعفر احراری ندوی | سیّد سلیمان ندوی | ۵ |
| پروفیسر محمد جعفر احراری ندوی | نئی غزل اور جاں نثار اختر | ۶ |
| شوکت علی | داستان پدماوت کا تاریخی پس منظر | ۱۰ |
| محمد عارف | حسرت موہانی بحیثیت صحافی | ۱۳ |
| طارق یوسف پرے | مولانا امتیاز علی خاں عرشی بحیثیت شاعر | ۱۵ |
| مدثر احمد گنائی | جمیل شیدائی کی ڈرامہ نگاری | ۱۷ |
| انجنا مینا | راجستھان میں دوہے کا سفر | ۲۰ |
| بلال احمد | شوکت احمد کی افسانہ نگاری کی امتیازی خصوصیات | ۲۲ |
| ایم۔اے۔ کائنات | معاصر اردو افسانوں میں خواتین کے مسائل | ۲۶ |
| ڈاکٹر علی محمد ڈار | کشمیری شعری ادب پر اردو کے اثرات۔ چند نمایاں مثالیں | ۲۸ |
| شازیہ اشرف | فکر تونسوی طنز و مزاح کے آئینے میں | ۳۲ |
| سید فریاد | آوازوں کا سنگم اردو | ۳۳ |
| مبارک حسین | اکیسویں صدی کی مسلم خواتین کی کردار نگاری اور نالۂ شب گیر | ۳۷ |
| ساجد منیر | علامہ اقبال کا تصور عشق اور مولانا روم | ۴۱ |
| محمد انعام | محمد عثمان عارف کی نعت گوئی: ایک جائزہ | ۴۳ |
| چمن آرہ | بہار میں اردو ناول ۱۹۸۰ کے قبل۔ اجمالی جائزہ | ۴۵ |

# تفہیم قصیدہ اور خورشید الاسلام


## ڈاکٹر محمد معین الدین

میرا روڈ، تھانے، مہاراشٹرا۔4011047

رابطہ:mkhanazizi@gmail.com


تخلیق و تنقید میں یکساں صلاحیت کے مالک خورشید الاسلام (۱۹۱۹۔۲۰۰۶) بیسویں صدی کے جہان شعروادب میں ایک منفرد شاعر ونقاد کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ حالی اور شبلی کی قائم کردہ بنیادوں پر تنقیدی عمارت کو مستحکم کرنے والوں میں خورشید الاسلام نے اپنی خلاقانہ بصیرت، انشاپردازانہ صلاحیت اور جذباتیت کی آمیزش سے اپنی تنقید کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری اور قاضی عبدالودود جیسی شخصیات نے ان کے منفرد اسلوب کو داد تحسین سے نوازا اور یہی اسلوب معاصرین میں ان کی انفرادیت کا سبب بنا۔ شارب ردولوی رقمطراز ہیں:

خورشید الاسلام اردو تنقید میں بڑا پُرفریب اسلوب لے کر آئے۔ پرفریب اس لیے کہ اس کو پڑھ کر ایک ساتھ کئی چیزوں کا احساس ہوتا ہے کبھی ان کے مضامین میں صرف انشائیہ کا شبہ ہوتا ہے کبھی تاثر کا پرتو گہرا ہو جاتا ہے، کبھی تشریحی انداز نمایاں ہو جاتا ہے اور کبھی ماڈی، تاریخی اور سماجی حقیقتوں کے پیش نظر ایک منفرد اور خوبصورت انداز میں کسی شہ پارے کے تعین کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب اردو تنقید میں منفرد ہے۔[۱]

بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ خورشید الاسلام اپنے تنقیدی سفر میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہے مگر ان کے تنقیدی تصورات کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ انھوں نے اپنے تنقیدی ارتقا کے مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے آخر کار یہ کلیہ قائم کیا کہ ادیب یا شاعر کو کسی تحریک، رجحان یا کسی خاص نقطۂ نظر کی قید سے آزاد ہونا چاہیے۔ حلقۂ ادب میں خورشید الاسلام کا مطالعہ بطور شاعر زیادہ اور بحیثیت نقاد کم کیا گیا بلکہ انھیں محض تاثراتی ناقد قرار دیا گیا، تاہم ان کی تصانیف میں خاص طور پر 'غالب تقلید اور اجتہاد'، 'تنقیدیں' اور 'تھری مغل پوئٹس: میر، سودا میر حسن' نیز ان کے تحریر کردہ بعض دیباچے انھیں ایک بالغ نظر، نکتہ شناس اور متوازن ادبی نقاد قرار دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خورشید الاسلام اپنے تنقیدی اسلوب اور انداز فکر کے لحاظ سے مولانا محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اور عبدالرحمن بجنوری کی صف میں شامل ہیں۔ تخلیقی صلاحیت کی بات کریں تو شاعری میں اب تک ان کے چار مجموعے 'رگ جاں'، 'شاخ نہال غم'، 'جستہ جستہ' اور 'یہ نوک خارمی رقصم' شائع ہو کر قبولیت عام وخاص حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے نظمیں اور غزلیں دونوں ہی کہیں ہیں بالخصوص ان کی پابند اور آزاد دونوں ہی نظموں پر فلسفیانہ رنگ غالب ہے۔ شاعری کے اسی فطری علاقے کی بنیاد پر انھوں نے مختلف کلاسیکی شعراء کے کلام اور ان کے دیوان بھی مرتب کیے جن میں 'دیوان قائم' اور 'کلام سودا' قابل ذکر ہیں۔ اردو قصیدہ نگاری کے باب میں کوئی مستقل تصنیف تو خورشید الاسلام کی نہیں ملتی تاہم اردو قصیدہ نگاری بالخصوص قصائد وہجویات سودا کے متعلق ان کے آراء ونظریات، ان کی کتاب 'تھری مغل پوئٹس: میر، سودا میر حسن' کے علاوہ 'کلام سودا' کے دیباچے میں ضرور ملتے ہیں۔ عام طور پر ان کی کتابوں کے دیباچے مختصر مگر معنویت و افادیت کے اعتبار سے جامع اور مستند ہوتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی کی ام الاصناف صنف قصیدہ ۱۸۵۷ سے پہلے اور کچھ عرصہ بعد تک بھی ایک قابل قدر صنف رہی ہے۔ ایران میں حافظ ونظیری کی غزلوں کے مقابلے خاقانی وانوری کی قصیدہ نگاری کا دور دورہ تھا، تو ہندوستان میں اردو قصیدہ نگاری میں سودا اور ذوق کا نام محض احترام سے ہی نہیں لیا جاتا تھا بلکہ سودا کو فارسی قصیدہ نگاروں کا ہم پلہ اور ذوق کو خاقانی ہند سمجھا جاتا تھا۔ مگر پہلی جنگ آزادی کے بعد اردو قصیدہ کو قصۂ پارینہ، مردہ یا از کار رفتہ، بے وقت کی راگنی، ہوس پیشگی اور خوشامد پسندی کا پیشہ قرار دیا گیا۔ اسی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے خورشید الاسلام نے بڑے دردمندانہ انداز میں کچھ اہم نکات اور متعدد سوالات قائم کیے ہیں جن سے اردو قصیدہ نگاری کے مطالعے میں از سر نو غور وفکر کی تحریک ملتی ہے:

...لیکن جوں جوں نئی تعلیم کا چرچہ پھیلتا گیا۔ اور جمہوری خیالات یا یوں کہیے کہ جمہوریت سے متعلق، چند فقرے یا اصطلاحیں عام ہوتی گئیں، قصیدہ کو خوشامد اور قصیدہ نگار کو نہ جانے کیا کیا سمجھا اور کہا جانے لگا۔ اس پر غور ہی نہیں کیا گیا کہ قصیدہ کیوں وجود میں آیا۔ یا یہ کہ فنون لطیفہ کی سرپرستی انیسویں صدی کے وسط تک کن طبقوں کی مرہون تھی۔ یا یہ کہ موجودہ زمانے سے پہلے شعر کے لیے مطبع، بازار اور اخبار کا کوئی انتظام قدرت کی طرف سے تھا یا نہیں نیز یہ کہ دربار ان کا بدل تھا یا نہیں۔ اس پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ قصیدہ کے عناصر ترکیبی میں مدح کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ مداح، ممدوح اور سامعین، مدح کو رسمی روایتی چیز سمجھتے تھے یا نہیں اور تشبیب کو قصیدہ کا جوہر سمجھتے تھے یا نہیں۔ نیز یہ کہ بڑی حد تک قصیدہ ان خیالات کا وسیلہ اظہار تھا یا نہیں جو ازمنۂ وسطی کی دین تھے۔[۲]

خورشید الاسلام نے مبنی بر حقیقت جو سچائیاں پیش کیں اور جو سوالات قائم کیے ہیں، راقم الحروف کے ناقص علم میں سید عبداللہ کے سوا شاید ہی

سے گزرنا تھا جو تقسیم اور آزادی نے انھیں بخشا تھا۔یعنی جو کل تک اپنے جاگیر کے مالک تھے اور آج بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں نے انہیں بے بسی اور مفلوج حال کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ان حالات وواقعات کا اظہار مشرف عالم ذوقی نے بڑے بے باک اور خوبصورت انداز میں اپنے اس ناول میں گوندھا ہے:

''سب چھوٹے، بڑے ہو جائیں گئے۔جو کل تک ہمارے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کرتے تھے،دیکھو آج کیسے سینہ تان کر چل رہے ہیں۔یہی آزادی کی سوغات ہے؟ جس نے چھوٹے بڑوں کے فرق ہی کو ختم کر دیا ہے۔۔۔اس آہٹ کو سنو، وسیع ورنہ یہ بڑا وقت تمہیں نگل جائے گا۔''[۳]

درجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹوٹتی مٹتی اخلاقی قدریں اور وقت اور علیٰ قدروں کے تصادم سے پیدا ہونے والی ایک نئی تہذیب کے کانٹوں کے جال میں پھنس کر کس طرح لوگ اپنے ہی شہر اور اپنے ہی علاقے میں رہتے ہوئے بھی اجنبی ہوئے،وقت کا جبر اور اس جبر کا ایک مہیب سناٹا اور اس سناٹے میں انسان کس طرح کٹھ پتلی کی مانند بے آواز اشاروں کے حوالے ہو رہا تھا۔مشرف عالم ذوقی کا یہ ناول اسی زندگی کے اتار چڑھاؤ،شکست وریخت ،رنج والم،آرزوں ، اُمنگوں،،بدحالیوں،بدلتے ہوئے اقدار،نئی نئی ایجادوں اور انسانی قدروں کی بے دریغ پامالی کی کڑیوں سے گزرتا ہوا عمل وردعمل کے میزان پر ایک نئی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔یہ ناول قاری کے ذہن میں بے شمار سوالات چھوڑ جاتا ہے۔انٹرنیٹ کے عہد میں تہذیبی شکست وریخت کا سیلاب آیا ہے اس میں پرانی اخلاقیات کی ساری کتابیں بہہ رہی ہیں اور ہم خاموش تماشائی بن گئے ہیں۔لے سانس بھی آہستہ کی کہانی آزادی کے دور سے شروع ہوتی ہے اور موجودہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ پیش کرتی ہوئی بابری مسجد کے انہدام تک سفر کرتی ہے۔ذوقی نے اس ناول میں تقسیم وطن،ہجرت،خون خرابے کے خطرناک حالات کو بھی پیش کیا ہے۔اس ناول میں ذوقی نے کاردار خاندان کے شجرہ نسل کی تصویر درج کی ہے،جس میں تین نسلوں کے سفر نے تین تہذیبوں کا راستہ طے کیا ہے۔۔عبدالرحمان کاردار،اس کے آباؤاجداد اور اس کے بعد کی نئی نسل۔موصوف نے اس ناول میں زندگی کے اُتار چڑھاؤ،کرداروں کی نفسیاتی جذباتی کشمکش،منظرنگاری،جذبات نگاری،مکالمہ نگاری وغیرہ کو بہت ہی باریک بینی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا۔

حوالہ جات:


۱۔اسلم آزاد : اردو ناول آزادی کے بعد ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ،دہلی ۲۰۱۴۔ص ۴۰۷

۲۔مشرف عالم ذوقی: بیان،تخلیق کار پبلشرز،نئی دہلی،۱۹۹۵۔ص ۳۵

۳۔مشرف عالم ذوقی :پوکے مان کی دنیا ۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ،۲۰۰۴۔ص ۳۳۰

۴۔ ناول،لے سانس بھی آہستہ،مشرف عالم ذوقی،ص ۴۲،عرشی پبلی کیشنز ،دہلی،۲۰۱۱



ریسرچ اسکالر شعبہ اردو،کشمیر یونیورسٹی


# کلیم الدین احمد کی قصیدہ تنقید پر ایک نظر


## ڈاکٹر محمد معین الدین


اردو کے سب سے متنازع نقاد کلیم الدین احمد کا شمار جدید اردو تنقید کے اہم معماروں میں ہوتا ہے۔تنازع کی وجہ عام طور پر ان کی مغرب زدگی اور سخت گیری کو قرار دیا جاتا ہے۔انھوں نے شاعری کے حوالے سے اپنے تنقیدی نظریات ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔اس کتاب میں انھوں نے وہ معرکۃ الآرا باتیں کہی ہیں جو ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئی ہیں جیسے ''غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے'' اور ''اردو میں تنقید کا وجود محبوب کی موہوم کمر ہے'' وغیرہ وغیرہ۔کلیم الدین احمد نے قصیدہ تنقید پر بھی اپنی بے باک رائے کا اظہار کیا ہے۔انھوں نے قصیدے کو اپنے پہلے جملے سے ہی رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''قصیدہ اپنی دشواری کی وجہ سے ہر دل عزیز نہ ہوسکا اور شعرا میں بھی قبولِ عام کی سند حاصل نہ کر سکا'' لیکن کلیم الدین احمد کی یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے۔دشواری کسی فن کا نقص نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمارے ذہن ودماغ کا نقص ہوتا ہے کیونکہ قصیدے میں کسی جن وپری کی زبان استعمال نہیں کی جاتی بلکہ وہی زبان ہوتی ہے جو ہم اور آپ بولتے ہیں، چونکہ قصیدہ خاص لوگوں کی محفل میں پڑھا جاتا ہے،ممدوح اور سامعین تب تک قصیدے سے محظوظ نہیں ہوسکتے جب تک وہ اس کے مفہوم کو نہ سمجھ سکیں۔غالبؔ کی شاعری اگر عام آدمی نہ سمجھ سکے تو اس سے غالبؔ کی عظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ قصیدہ عام طور پر غزل کے مقابلے میں تھوڑا مشکل ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ قصیدہ مشکل ہونے کی وجہ سے بے وقعت ہو جاتا ہے۔کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ قصیدہ کی غرض وغایت کسی کی تعریف ہوتی ہے اور وہ بھی نہایت مبالغہ آمیز۔کسی بادشاہ یا کسی امیر کی تحسین مدنظر ہوتی ہے اور یہ تحسین اس بادشاہ یا اس امیر کے عدل یا جود وسخا سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ نفع کی امید میں کی جاتی ہے عموماً ممدوح اس مبالغہ آمیز مدح کے عشرِ عشیر حصہ کا بھی مستحق نہیں ہوتا۔اگر اکثر وبیشتر نفع کی امید مدح کی محرک ہوتی ہے تو کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر قصیدہ کو اظہارِ عقیدت کا ذریعہ بناتا ہے۔اس طرح قصیدہ میں مذہب اور مذہبی عقائد کی رنگ آمیزی ہوتی ہے، لیکن یہ رنگ آمیزی کسی گہرے، پُرجوش مذہبی جذبے سے متاثر ومجبور ہو کر نہیں ہوتی۔اس قسم کے قصیدوں میں عقیدت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔[۱]

یہاں پر کلیم صاحب کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے ہیں، یہاں انھوں نے

## اس شمارے میں


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | مشعل | مدیر | 4 |
| شخصیت | دکن کی مایہ ناز محقق ڈاکٹر ثمینہ شوکت | ڈاکٹر رؤف خیر | 5 |
| جہانِ نسواں | نواب شاہ جہاں بیگم: بھوپال کی نامور خاتون حکمراں | ڈاکٹر نکہت فاطمہ | 10 |
| | منٹو کے افسانوں میں تانیثی عناصر | ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ | 14 |
| | قرۃ العین حیدر: اپنی تخلیق کے آئینے میں | ڈاکٹر محمد شارب | 18 |
| | لکھنوی تہذیب اور مسرور جہاں کے افسانے | شائستہ عالم | 25 |
| | ہندوستانی معاشرے میں 'عورت سے' منسوب محاورات اور کہاوتیں | فردوس انجم شیخ آصف | 28 |
| | شہزادی کلثوم: راجستھان کی ایک معصوم شاعرہ | مسرت پروین | 31 |
| | خواتین فرہنگ نویس کی فرہنگوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ | شاذیہ زریں | 34 |
| شناخت | گورکھپور میں اردو ادب کا درخشاں ستارہ ڈاکٹر درخشاں تاجور | بشریٰ صدیقی | 40 |
| نکہتِ سخن | شاعرات کے منتخب اشعار | | 43 |
| افسانہ | امیدوں کا موسم | صائمہ انصاری | 44 |
| ڈراما | صحرا سے نخلستان تک | ڈاکٹر شہناز صبیح | 47 |
| حسنِ سخن | شمشاد بیگم سنبل، ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی، ذکیہ شیخ مینا | | 50 |
| باورچی خانہ | لذیذ پکوان | | 52 |
| صحت | قوت بخش اور لذت سے بھرپور غذا | محمد طاہر صدیقی | 54 |
| آرائش وزیبائش | | | 57 |
| تاثرات | تاثرات نگر نگر سے | | 59 |
| خواتین خبرنامہ | | | 61 |



آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 9 ستمبر 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

**ناشر اور طابع**

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL)
اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

**صدر دفتر**

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

**شعبۂ فروخت**

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040 - 24415194

# منٹو کے افسانوں میں تانیثی عناصر

ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ

اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو اردو ادب کا ایک بڑا افسانہ نگار ہے۔اس نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں اردو ادب کو جن مسائل سے روشناس کرایا اس کی عکاسی شاید صدیوں تک ممکن نہیں ہو پاتی اگر منٹو اس میدان میں اپنا قدم نہ رکھتا۔حالانکہ وہ اردو ادب کا سب سے بدنام افسانہ نگار بھی تصور کیا جاتا ہے۔لیکن وہیں دوسری طرف وہ اپنے مخصوص اندازِ بیان کی وجہ سے بے مثال بھی ثابت ہوا۔منٹو کی نظروں کے سامنے جو حالات تھے،جن میں اس کی زندگی کی نشو ونما ہوئی،کہیں نہ کہیں وہ ایک انقلابی دور تھا،ہندوستان کی تحریک آزادی زوروں پر تھی اور اردو ادب کے نامور مصنفین اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لے رہے تھے۔منٹو کا ذہن بھی اس فضا میں الجھ کر رہ گیا۔لہٰذا جب منٹو نے تخلیق کی دنیا میں قدم رکھا تو وہ سارے واقعات اس کے ذہن میں ایک کولاج کی صورت میں موجود تھے۔اس لیے منٹو نے سماجی وسیاسی،معاشی ومعاشرتی مسائل کے درمیان سے ایک ایسے پہلو کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی جو ہمارے سماج میں آئے دن آتے رہتے ہیں۔لیکن ہمارا سماج اور ہمارے نظامی اقدار اسے اپنی ذمہ داری کے حصے سے پرے سمجھتے ہیں۔منٹو نے سماجی وسیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ عورتوں کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا محور بنایا۔عورتوں کی زندگی اس کے افسانوں میں اس قدر رچ بس گئی کہ پھر اسے عورتوں کا افسانہ نگار سمجھا جانے لگا۔ ڈاکٹر اطہر پرویز اپنی کتاب 'منٹو کے نمائندہ افسانے' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ:

''منٹو کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ حقیقتاً 'عورت' کا افسانہ نگار ہے۔عورتوں کے لیے منٹو کے دل میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔جیسا کہ عام خیال ہے منٹو عورت کے صرف جنسی پہلو کو دیکھتا ہے۔یہ منٹو کو نہ سمجھنے کی بنا پر ہے۔منٹو کی عورتیں ہی منٹو کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہیں۔وہ چاہے زینت ہو یا جانکی،موذیل ہو یا برمی عورت،ممی ہو یا نیلم۔۔اس کے نزدیک عورت کا سب سے مقدس لمحہ وہ ہوتا ہے جب اس کے اندر ماں کی ممتا جاگتی ہے اور یہیں ہمیں منٹو کا اصل روپ نظر آتا ہے۔شاردا نذیر سے بے تعلق رہتی ہے،اس سے چڑھتی ہے لیکن جس وقت نذیر اس کے اندر کی ماں کو چھوتا ہے تو عورت نذیر کو بھی پیار بھری نظر سے دیکھتی ہے۔جب اس بچے کو دیکھ کر نذیر کہتا ہے کہ اس بچے کی ماں تو میں ہوں تو وہ اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتی ہے اور ہم بھول جاتے ہیں کہ ابھی اس عورت نے نذیر کو پیار کرنے کی وجہ سے زمین پر تین بار حقارت سے تھوکا تھا۔غصے میں غالباً گالیاں دینے والی تھی کہ اس کے بچے کی رونے کی آواز آئی اور شاردا ماں بن گئی اور جب نذیر پوچھتا ہے کہ آپ کہاں جا رہی ہیں تو وہ ماں بن کر کہتی ہے 'منی رو رہی ہے،دودھ کے لیے'.....یہ نذیر نہیں بلکہ منٹو کہہ رہا ہے کہ 'یہ دودھ.....

# سبق اردو

ستمبر،۲۰۲۱

ایڈیٹر،پرنٹر،پبلشر : ڈاکٹر محمد سلیم | سرنامہ : عادل منصوری | جلد : ٦ | شمارہ :٦

موبائل:9696486386 | سرورق : دانش الہ آبادی | Net Banking:SABAQ -E-URDU( MONTHLY)

واٹس ایپ:9919142411 | کمپوزنگ : دانش الہ آبادی،اہل قلم | IFSC BARB 0 GOPI BS A/C28240200000214

مطبع:عظیم انڈیا پریس، گوپی گنج، بھدوہی | Bank of Baroda, Branch: Gopiganj

فی شمارہ: -/100،زرتعاون:-/1000 زرتعاون خاص:-/2000،اعزازی تعاون:-/5000 | Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔کسی بھی معاملے کی سنوائی صرف ضلع بھدوہی ہی کی عدالت میں ہوگی۔ادارہ

| | | |
|---|---|---|
| ڈاکٹر/تغرید محمد البیومی السید | اکیسویں صدی کا تحقیقی وتنقیدی منظرنامہ اقبال اور عشق "مسجد قرطبہ" کے تناظر میں | ۴ |
| ڈاکٹر مُعید الظَّفر | حکیم منظور: جذبات اور احساسات کا شاعر | ۷ |
| ڈاکٹر قیصر احمد | شہزادی زیب النساء ایک ناقابل فراموش صوفی شاعرہ | ۱۰ |
| ڈاکٹر عرفان رضا | مخطوطات شناسی (ایک اجمالی جائزہ) | ۱۵ |
| اعجاز احمد میر | جدید اُردو نظم نگاری کے ارتقاء میں آزادؔ اور حالیؔ کا حصّہ | ۱۸ |
| محمد عارف | کرشن چندر؛ قبائلی ثقافت کا ترجمان (پیدائش.دسمبر۱۹۱۲ء۔وفات۔۸.مارچ۔۱۹۷۷ء) | ۲۰ |
| ڈاکٹر محمد ارشاق اصغرؔ | امیر مینائی کی اردو شاعری: ایک مطالعہ | ۲۲ |
| جاوید احمد | انیس اشفاق کی شاعری ''ایک نیزہ خون دل'' کی روشنی میں | ۲۶ |
| ڈاکٹر عبدالقیوم ملک | بیسویں صدی میں اردو صحافت | ۲۸ |
| پی محمد جعفر | نور آفاق۔ادبِ اطفال کا منفرد شاعر | ۳۰ |
| محمد لطیف | اقبال کے فکری نظام میں مجتہدانہ اور تقلیدی عناصر | ۳۲ |
| توصیف احمد ڈار | تانیثیت بنیادی مباحث اور دائرہ کار | ۳۵ |
| ڈاکٹر روی کمار | اردو شاعری میں تصوف کی روایت: نمائندہ شعرا کے حوالے سے | ۳۸ |
| سنگیتا دیوی | اردو ناول کا موضوعاتی مطالعہ | ۴۱ |
| ڈاکٹر نصرت بانو | سوانح نگاری کا آغاز وارتقاء | ۴۴ |

| | | |
|---|---|---|
| تجمل حسین | اکیسویں صدی میں خلیق انجم کی معنویت متنی تنقید کے حوالے سے | ۴۶ |
| زاہد حسین میر | اردو میں تاریخ نویسی، اصول وضوابط | ۴۹ |
| ہردئے بھانو پرتاپ | ولی کی شاعری میں عشق کا تصور | ۵۳ |
| تسلیم فاطمہ | اردو افسانے میں فرقہ واریت کی روایت اور اقبال متین | ۵۶ |
| شبیر احمد راتھر | غلام نبی شاہد کے افسانوں میں عصری حسیت | ۵۹ |
| فردوس احمد بھٹ | نوآبادیاتی ہندوستان کا منفرد ناول نگار: ڈپٹی نذیر احمد | ۶۳ |
| محمد فہیم | مشتاق احمد یوسفی کا اسلوب نگارش | ۶۷ |
| ارشد علی | اقبال اور ٹیگور کی شاعری میں حرکی و فعلی عناصر | ۷۰ |
| شاہد حسین ڈار | شمس الرحمٰن فاروقی اور افسانے کی تنقید | ۷۲ |
| ڈاکٹر ارشد احمد کوچھے | ''نیل دھارا'' ایک ممنوعہ محبت کی کہانی | ۷۷ |
| فیروز عباس | اودھ کا جغرافیائی پس منظر | ۷۹ |
| منظور حسین | ناول 'ہاں! میں دیش بھکت ہوں': ایک جائزہ | ۸۱ |
| ڈاکٹر پرویز احمد | آئینہ ایام | ۸۳ |
| مجوفہ | چکِ اشر داس پتی غوط پورہ، بڈگام، عبداللہ حسین کا شاہکار | ۸۵ |
| نگہت امین | عصمت چغتائی اور ٹیڑھی لکیر: حقوقِ نسواں کی روشنی میں | ۹۰ |
| زاہد ظفر | تدوین متن اور رشید حسن خاں (فسانۂ عجائب کے حوالے سے) | ۹۴ |
| شہریار کا شعری بیانیہ | ڈاکٹر محمد رئیس | ۹۷ |
| ڈاکٹر راحت حسین | راحت اندوری: ایک بے باک وعوامی شاعر | ۹۹ |
| شاہین کوثر | پروفیسر رئیس انور کی تنقیدی کارگزاریاں | ۱۰۱ |
| جاوید احسن | شاہ تراب علی قلندر کاکوروی کی فارسی شاعری | ۱۰۴ |
| وکرانت کمار | اردو شاعری کی منفرد آواز صوفیہ انجم تاج | ۱۰۷ |
| ثمرین پروین | حسین الحق کی افسانہ نگاری | ۱۰۹ |
| سائرہ سلطانہ | ناول خدا کی بستی فن کے آئینے میں | ۱۱۲ |
| نثار احمد والو | دلور آم کوثری کا نعتیہ شعری نگارخانہ ''ایک مطالہ'' | ۱۱۶ |
| ڈاکٹر ریاض احمد کمہار | حالی اور اصلاح معاشرہ | ۱۱۸ |
| ڈاکٹر رضا احمد | جدید اُردو ادب میں مولانا حالی کا کردار | ۱۲۱ |
| رفعت آراء | فاروق نازکی کی غزل گوئی | ۱۲۴ |
| محمد باقر حسین | تنقید کی تدریس | ۱۲۷ |

# وؔلی کی شاعری میں عشق کا تصور


## ہردئے بھانو پرتاپ


اردو شاعری میں عشق کا تصور کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اردو شاعری اور عشق دونوں ابتداء سے ہی لازم و ملزوم کی صورت میں دکھائی دیتے رہے ہیں ۔شاعری کا سفر رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا اور مختلف ادوار میں مختلف کیفیات اور رنگ و روپ کے ساتھ اس نے زمانے کے اتار چڑھاو کا سامنا کرتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھا۔ اس طویل سفر میں عشق کا رنگ اور گہرا ہوتا گیا اور عشق نے اپنا دامن اتنا وسیع کر لیا کہ دنیا کا کوئی بھی موضوع باقی نہیں رہا جسے عشق کے رنگ میں بیان نہیں کیا جا سکے۔ عشق جو ہماری زندگی کا اوڑھنا اور بچھونا بن گیا ہے جو دیکھنے میں بہت عام سا لفظ معلوم ہوتا ہے، لیکن جب اس موضوع پر کچھ نیا تحقیقی مقالہ یا مضمون لکھنے کی بات ہوتی ہے تو ایک لمحے کے لیے قلم رک سا جاتا ہے۔ اور جب ولی جیسے بڑے شاعر کے کلام سے متعلق کچھ لکھنا ہو تو اور بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ولی دکنی کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اُسے ایک زمانے تک اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا جاتا رہا اور دوسری طرف کچھ لوگ اُسے اردو شاعری کا چاسر بھی قرار دیتے رہے۔ یہ دونوں نکات آج کی تاریخ میں غلط ثابت ہو چکے ہیں لیکن ان پر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں نکات میں کوئی نہ کوئی راز تو ضرور پوشیدہ ہے۔ یہ راز کچھ اور نہیں بلکہ ان کی شاعری کی شہرت اور مقبولیت تھی۔ جو دکن سے لے کر شمالی ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی شہرت اور عظمت کا اندازہ سید احتشام حسین کے اس بیان سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

”کہا جاتا ہے کہ ان کا نام ان سے پہلے دلّی پہنچ گیا تھا، اور ان کی غزلیں وہاں کی گلیوں اور بازاروں میں گائی جاتی تھیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جنوبی اور شمالی ہند میں ادبی روابط قائم ہو رہے تھے اور دلّی کے شعرا کو اردو کے یہ نمونے نئے اور قابل تقلید معلوم ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب وہ دلّی پہنچے تو ان کی بڑی آو بھگت ہوئی۔“ (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ - سید احتشام حسین - صفحہ نمبر ۴۲)

یہاں اس اقتباس کا ذکر کرنے سے میری مراد صرف یہ ہے کہ وؔلی کو پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دینا یا پھر اردو شاعری کا چاسر کہنا، یہ ان کی شہرت اور عظمت کی وجہ سے تھا نہ کہ قیاس آرائی کی وجہ سے۔ گرچہ اردو شاعری کے ابتدائی نقوش شمالی ہند میں تیرہویں چودہویں صدی سے ہی دکھائی دیتے ہیں لیکن اصل فروغ اِسے دکن میں ہی حاصل ہوا۔ عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں نے اردو شاعری کے فروغ میں بنیادی کام کیا۔ بادشاہ قلی قطب شاہ خود بھی شاعری کرتے تھے۔ وہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دکن کے بادشاہوں نے شعر و شاعری کا جو چراغ دکن میں روشن کیا تھا اس کی روشنی سے ولی دکنی نے پورے ہندوستان کو منور کر دیا۔ ان کی اس کاوش کی وجہ سے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ولی چاسر نہ سہی لیکن چاسر سے کم بھی نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں نہ صرف اردو کی ابتدائی شاعری کا بہترین نمونے دکھائی دیتے ہیں بلکہ فرش سے عرش تک کا سفر بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ موضوعاتی سطح پر ان کی شاعری میں تصوف اور عشق کے بہتریں مضامین دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں تصوف اور عشق کا ایسا حسین امتزاج پیش کیا ہے کہ ہر کس و ناکس اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وؔلی کی نظر میں عشق مجازی ہی عشق حقیقی کا پہلا پائدان ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

در وادیِ حقیقت جس نے قدم رکھا ہے
اوّل قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا
مجھے بولا کہ اگر عشقِ حقیقی سے تو واقف نئیں
تو بہتر ہے جا دامن پکڑ عشقِ مجازی کا

یعنی وؔلی دکنی نے اپنی شاعری کے ذریعہ عشق کے موضوع کو جو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے، جو وسعت بخشی ہے، اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے کم ہوگا۔ کیونکہ ولی نے صرف روایتی عشق کو اپنی شاعری میں نہیں پرویا ہے بلکہ روایت سے بغاوت بھی کہ ہے۔ اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ ’ولی نے اپنے کلام میں تمام وہ خیالات و مضامین مختلف طرز ادا کے ساتھ لکھے ہیں، جن کا رواج متاخرین فارسی شعرائے میں ہو چکا ہے یا جس تنوع کو آج چاہا جا رہا ہے۔“ اردو تنقید میں سائنٹفک نقطۂ نظر رکھنے والے ترقی پسند نقاد سید احتشام حسین نے وؔلی دکنی کی شاعری میں نظر آنے والے مضامین کے بارے میں لکھا ہے کہ؛

”وؔلی نے اپنی غزلوں میں زیادہ تر محبت کے جذبات کا بیان مختلف صورتوں سے کیا ہے۔ یہ جذبہ محبت وسعت اختیار کر کے مسلکِ تصوف کا عشق بن گیا ہے۔ اردو شاعری میں ابتداء سے ہی تصوف کے خیالات جاری و ساری ہیں۔ ولی نے بھی ان خیالات کو بڑی خوبصورتی، ولولے اور قوت کے ساتھ پیش کیا ہے غزلوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ ان میں عام قلبی جذبات کو آپ بیتی کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ تصوف بھی باطنیت اور داخلیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس لیے وؔلی کی غزل پُر اثر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سچے عاشق کے حقیقی خیالات پیش کرتی ہے۔ وؔلی کی شاعری کا تجزیہ کرنے سے ایک بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ ان پر فارسی شاعروں کا گہرا اثر تھا۔ ان کے خیالات بھی کہیں کہیں ان سے ملتے جلتے ہیں مگر ان میں اتنی صداقت پائی جاتی ہے کہ وہ باہر سے مانگے ہوئے خیال نہیں معلوم ہوتے۔ ہندوستانی زندگی کی تصویریں بھی وؔلی کے یہاں کم نہیں ہیں۔ گنگا، جمنا، کرشن، رام، سرسوتی، سیتا، لکشمی سبھی کے نام ان کے کلام میں بار بار آتے ہیں اور تہذیبی وحدت کی جانب بڑھتے ہوئے تصورات کا اِشاریہ ہیں۔

“(اردو ادب کی تنقیدی تاریخ - سید احتشام حسین - صفحہ نمبر ۴۳)

اس اقتباس سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ولی کی شاعری کا مرکز اوّل و آخر عشق ہے۔ اس لیے وؔلی کی شاعری میں عشق کا تصور تلاش کرنا کوئی

| | | |
|---|---|---|
| 10 | اردو زبان کی تعلیم اور روز گار کے مسائل<br>سعدیہ پروین نہال احمد: اسسٹنٹ پروفیسر (اردو، فارسی) آرٹس، کامرس وسائنس کالج، مالیگاؤں سٹی، انڈیا | 52-54 |
| 11 | حامدی کاشمیری بحیثیت افسانہ نگار<br>شبیر احمد راتھر (احمد شبیر راتھر): ریسرچ اسکالر، یونیورسٹی آف کشمیر، جموں وکشمیر۔ انڈیا | 55-57 |
| 12 | کرشن چندر: ایک جائزہ<br>نفیسہ بیگم شیخ جیلانی: ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بامو، اورنگ آباد، مہاراشٹر۔ انڈیا | 58-60 |
| 13 | جادہ نور میں مدحت رسول کے رنگ<br>ڈاکٹر بسمینہ سراج: صدر شعبہ اردو، شہید بینظیر بھٹو خواتین یونیورسٹی، پشاور۔ پاکستان<br>نبیلہ شاہین: ایم فل ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، شہید بینظیر بھٹو خواتین یونیورسٹی، پشاور۔ پاکستان | 61-66 |
| 14 | پریم چند کے ناولوں میں طبقاتی شعور: تجزیاتی مطالعہ<br>ڈاکٹر محمد زکریا محمد اسماعیل: سابق اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، کے آر ایم مہیلا کالج، ناندیڑ، مہاراشٹر۔ انڈیا | 67-71 |
| 15 | ترنم ریاض: حیات وکارنامے تفصیلی جائزہ<br>ڈاکٹر جاوید اقبال شاہ: گورنمنٹ ڈگری کالج، بھدرواہ، جموں وکشمیر۔ انڈیا | 72-78 |
| 16 | افسانہ چوتھی کا جوڑا میں ہندی رسم ورواج کی عکاسی<br>ڈاکٹر سنجے کمار: اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ پی جی ڈگری کالج، بھدرواہ، جموں وکشمیر۔ انڈیا | 79-81 |
| 17 | فن ترجمہ نگاری۔۔۔ ایک اجمالی جائزہ<br>ڈاکٹر خلیل احمد ریشی: اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج، پونچھ، جموں وکشمیر۔ انڈیا | 82-86 |
| 18 | اردو میں ماہیا، ہائیکو اور ثلاثی کی روایت<br>**Dr. Hriday Bhanu Pratap:**<br>Assistant Professor,Department of Urdu, Zakir Husain Delhi College,University of Delhi- India | 87-91 |
| 19 | مولانا محمد علی جوہر کی مختصر سوانح<br>ڈاکٹر اعلم شمس: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ انڈیا | 91-94 |

Urdu Scholars Ki Duniya- International Refereed Journal for Urdu ISSN 2320-5369, EISSN 2320-8910
IF: Cosmos Impact Factor: 3.527 IF: Global Impact Factor: 0.383

# اردو میں ماہیا، ہائیکو اور ثلاثی کی روایت

**Dr. Hriday Bhanu Pratap**

Assistant Professor,Department of Urdu, Zakir Husain Delhi College,University of Delhi- India

پنجابی لوک گیتوں میں ''ماہیا'' ایک اہم صنف ہے۔ یہ نام لفظ ''ماہی'' سے مشتق ہے۔ چونکہ پنجابی میں بھینس کو مہی کہتے ہیں اور اسی نسبت سے بھینس چرانے والے کو ''ماہی'' کہا جاتا ہے۔ پنجاب کی عشقیہ داستانوں میں رانجھا اور مہیوال دو ایسے اہم کردار ہیں جنھوں نے اپنے محبوب تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بھینس بھی چرایا تھا۔ ان رومانوی کرداروں کی مقبولیت نے لفظ ماہی کو صرف ہیر اور سوہنی کا محبوب نہیں بنایا بلکہ ہر محبت کرنے والی مٹیار کا محبوب ماہی کہلایا۔ اسی نسبت سے عاشق اور معشوق کے تعلق اور معاملات عشق کے اظہار کے لئے پنجابی لوک گیتوں میں ''ماہیا نگاری'' بحیثیت صنف پروان چڑھی۔

اس صنف کے ابتداء میں محبوب کے حسن و جمال، پیار، محبت، ملن، جدائی، گلے، شکوے، چھیڑ، چھاڑ کے موضوعات کثرت سے ملتے ہیں۔ اردو شاعری کی دیگر اصناف کی طرح ''اردو ماہیا'' نے بھی کروٹ بدلی تو اس کے موضوعات میں وسعت اور رنگینی پیدا ہوئی، پھر اس میں زندگی کے مختلف مسائل اور دکھ درد کا بھی اظہار ہونے لگا۔ مزید اس کے حمدیہ، نعتیہ، ماہیے بھی کہے گئے اور بزرگان دین کی توصیف بھی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دعائیہ ماہیے بھی لکھے گئے اور روز مرّہ کی زندگی کے معاملات اور رشتوں کے نازک خیالات کو بھی اردو ماہیا میں بہت کامیابی کے ساتھ پیش کیا جانے لگا۔

''ماہیا'' کے چند اور نام بھی ہیں جن میں ''بگڑو'' اور ''ٹپا'' قابل ذکر ہیں۔ تاہم بحیثیت صنف شاعری ''ماہیا'' کی اصطلاح زیادہ مقبول ہوئی۔ ہیئت کے لحاظ سے ماہیا کی تین چار قسمیں دستیاب ہوتی ہیں، جو معمولی سی ردوبدل کے ساتھ چھ سے سات مصرعوں پر مستعمل ہیں۔ دوسری ہیئت کے ماہیے سننے والوں نے انھیں محض لوک گیتوں میں شمار کیا ہے۔ ان میں بھی تین مصرعوں پر مستعمل ماہیے بے حد مقبول ہوئے اور اسی ہیئت کو ہمارے اردو شعراء نے بھی منتخب کیا۔ تین مصرعوں کی ہیئت والے پنجابی ماہیوں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

سونے دا کل ماہیا — دو کاج کمیضاں دے
لوکا دیاں رون اکھیاں — اساں کل ٹر جانا
ساڈا روندا اے دل ماہیا — فر میل نصیباں دے

اکھ رو رو سک گئی اے — آری آتے آری اے
لوکاں دی مویاں مکدی — اک دم یوسف دا
ساڈی جیوندیاں مک گئی اے — سارا مصر و پاری اے

کوٹھے اتے رسیاں نیں — باری وچ کھیس پیا
کیجئے زبان دیئے — اک دم بچنا دا

# سبق اردو

نومبر، ۲۰۲۱


ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: ڈاکٹر محمد سلیم | سرنامہ : عادل منصوری | جلد : ۶ | شمارہ : ۸

موبائل:9696486386 | سرورق : دانش الٰہ آبادی | Net Banking:SABAQ -E-URDU( MONTHLY)

واٹس ایپ:9919142411 | کمپوزنگ : دانش الٰہ آبادی، اہل قلم | IFSC BARB 0 GOPI BS A/C28240200000214

sabaqeurdu@gmail.com | مطبع: عظیم انڈیا پریس، گوپی گنج، بھدوہی | Bank of Baroda, Branch: Gopiganj

فی شمارہ: -/100، زرتعاون:-/1000 | زرتعاون خاص:-/2000، اعزازی تعاون:-/5000 | Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA



کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کی سنوائی صرف ضلع بھدوہی ہی کی عدالت میں ہوگی۔ ادارہ


## چیف ایڈیٹر — دانش الٰہ آبادی


| | | |
|---|---|---|
| ڈاکٹر محمد توحید خان | عصمت چغتائی کی شخصیت اور فکری تشکیل | ۴ |
| پروفیسر عزیز بانو | عہد بہمنیہ کی تاریخ کے فارسی مآخذ | ۱۳ |
| ڈاکٹر فیروز عالم | عصر حاضر کا کرب واضطراب اور سلام بن رزاق کا افسانہ ''گیت'': ایک تجزیاتی مطالعہ | ۱۶ |
| خیر النساء | علامہ اقبال بحیثیت غزل گو | ۱۹ |
| ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں | فارسی کے صوفی شعراء | ۲۰ |
| مسرت آرا | اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں تانیثیت: ایک جائزہ | ۲۳ |
| شائستہ عالم | غزال ضیغم کے افسانے اور ماضی کی بازدید | ۲۵ |
| محمد ضیاء المصطفیٰ | اردو صحافت کی مختصر تاریخ | ۲۷ |
| عذرا سہیل | پیتل کا گھنٹہ کل اور آج کے تناظر میں | ۳۰ |
| پھلیل سنگھ | ظہور الدین علمی وادبی خدمات کے آئینے میں | ۳۱ |
| سید محمد ظفر اقبال | لکھنوی تہذیب ومعاشرت کا عکاس: امراؤ جان ادا | ۳۴ |
| ڈاکٹر نصیر احمد ڈار | جنوبی کشمیر میں اُردو ادب کا آغاز وارتقا | ۳۶ |
| شازیہ پروین | تجلی علی شاہ: شخصیت اور علمی نقوش | ۳۸ |
| محمد خواجہ محی الدین | سوانح حیات مولانا محمد خواجہ شریف | ۴۰ |
| رمیص سلطان پوری | حنیف نقوی کا تحقیقی اسلوب | ۴۳ |

| | | |
|---|---|---|
| محمد جلیل اقبال خاکی | مشاعرے: امن کے نقیب اور ہندوستانی تہذیب کے عکاس | ۴۶ |
| ڈاکٹر ای۔ محمد انور حسین | مظہر الزماں کی افسانہ نگاری | ۴۸ |
| ڈاکٹر جگد مبا دوبے | اقبال مجید بحیثیت مضمون نگار | ۵۰ |
| صوفیہ | 'لالہ رخ' پر ایک نظر | ۵۲ |
| محمد موسیٰ | مولانا محمد عثمان فارقلیط کی صحافتی خدمات | ۵۵ |
| پریم پرکاش بھارتی | انیثیت کا مکمل اظہاریہ: نادیدہ بہاروں کے نشاں | ۵۷ |
| آسیہ یاسمین | شائستہ فاخری کے ناولوں میں تانیثی فکر کے بدلتے شعور | ۶۰ |
| میر راشد | ''نیاز فتح پوری کے افسانوں میں رومانیت اور سماجی حقیقت نگاری: ایک جائزہ'' | ۶۴ |
| ڈاکٹر نہال احمد انصاری | وحشت کلکتوی۔فن وشخصیت | ۶۶ |
| سلیقہ جان | ''وُلر کنارے'' کا تجزیاتی مطالعہ | ۷۰ |
| صدف نفیس | صلیبیں میرے دریچے میں: ایک تنقیدی محاکمہ | ۷۲ |
| ڈاکٹر جہاں گیر احمد خاں | قاضی عبدالغفار کی سیاسی سرگرمیاں | ۷۵ |
| گلزار احمد ڈار | اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش | ۷۷ |
| محمد محبوب | تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ۔ایک جائزہ | ۸۰ |
| بشیر شاہین | پروفیسر گیان چند جین | ۸۴ |
| سعیدہ رخسانہ بیگم | ادب اور صحافت کا رشتہ اور ادبی صحافت | ۸۷ |
| شاہنواز عالم | ''راجندر سنگھ بیدی کا افسانوی امتیاز'' | ۸۸ |
| محمد یونس ٹھوکر | عمیرہ احمد کے ناولوں میں جدید مسلم معاشرے کے مسائل کی بوقلمونی | ۹۱ |
| ڈاکٹر شیخ عمران | مثنوی ''زہر عشق'' ایک جائزہ | ۹۳ |
| اظہر سراج | اُردو میں ترقی پسند ناول نگاروں کا مجموعی جائزہ | ۹۵ |
| عبدالواجد زرگر | ڈراما ''بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا'' ایک تنقیدی مطالعہ | ۹۹ |
| ڈاکٹر شکیلہ کے پی | سرسید احمد خان بحیثیت مضمون نگار | ۱۰۲ |
| ڈاکٹر سید کلیم اصغر | ''دور حاضر میں سید محمد کمال سنبھلی کے افکار کی اہمیت اسرار یہ کشف صوفیہ کے حوالے سے'' | ۱۰۴ |
| نفیس زہرا | اردو مراثی میں قومی یکجہتی کے عناصر | ۱۰۸ |
| ڈاکٹر سید کلیم اصغر | داستان کوتاہ 'خاک' کی انفرادیت | ۱۱۱ |
| ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ | داستان 'سب رس' کا تہذیبی مطالعہ | ۱۱۵ |
| اعلم شمس | عشق میر کی کائنات | ۱۱۸ |
| مہرین شفیع | فوزیہ نسیم مغل ضیاء بحیثیت شاعرہ | ۱۲۱ |
| ڈاکٹر محمد آصف ملک | جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں تصورِ محبوب | ۱۲۴ |
| رضیہ عائشہ جوائز | افسانہ ''کوآپریٹو سوسائٹی'' اور ہمارا معاشرہ | ۱۲۶ |

# داستان ’سب رس‘ کا تہذیبی مطالعہ




## ڈاکٹر ہردئے بھانو پرتاپ


ادب میں شعری ونثری اصناف کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی جذبات واحساسات کے گونا گوں پہلو کو بیان کرنے کے لیے کبھی فن شاعری کی ضرورت پڑتی ہے تو کبھی نثر کی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں جہاں ایک طرف شاعری ہے تو دوسری طرف نثر بھی موجود ہے۔ اردو ادب میں یہ دونوں جواہر پارے مختلف اصناف کی صورت میں ایک طویل عرصے سے موجود ہیں۔ جس میں ہم اپنے قدیم تہذیبی وثقافتی وراثت کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ بیش قیمتی سرمایہ ہمارے موجودہ تہذیب وثقافت کو اور بھی رِچ (Rich) بناتا ہے۔

اردو ادب میں جس طرح سے غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کو مقبولیت حاصل ہوئی ٹھیک اسی طرح داستان نے بھی اپنے فنی وادبی سحر سے عوام کو بہت متاثر کیا اور ہر عام وخاص میں یکساں مقبول ہوئی۔ خاص طور سے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اردو داستان کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ مثلاً قصہ مہر افروز دلبر، نوطرز مرصع، عجائب القصص، فسانہ عجائب، بوستان خیال، اور داستان امیر حمزہ وغیرہ فورٹ ولیم کالج سے قبل ہی عوام کے درمیان مشہور تھیں۔ فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی داستانوں میں باغ وبہار، آرائش محفل، طوطا کہانی، مذہب عشق کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ داستانوں کے موضوعات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر داستانوں میں محبت اور جنگ کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ ان داستانوں میں ایک شہزادہ اور ایک شہزادی کے معاشقے کی کہانی بیان ہوتی ہے لیکن داستان گو اپنے کمال فن سے اس ایک کہانی میں بے شمار کہانیاں پیدا کرتا ہے۔ چونکہ داستان جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہے اس لیے اس میں جاگیردارانہ نظام کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔ داستانوں کا ہیرو ایک شہزادہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے ملک یا ریاست کی شہزادی سے عشق کر بیٹھتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی فوج کے ساتھ نکل پڑتا ہے۔ یعنی معشوق کی حصولیابی کے لیے وہ اپنے جاہ وجلال، عظمت اور شہرت، سینا اور فوج کا استعمال کرتا ہے۔ اس طرح پوری کہانی شہزادے کی کہانی کے ارد گرد گھومتی ہے اور ہیرو کے فتح یاب ہونے کے ساتھ ہی داستان اپنے انجام پر پہنچ جاتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ داستان گو اپنی کہانی میں جس ہیرو کی بہادری کو بیان کرتا ہے دراصل وہ اس کے پس پردہ وہ اپنے دور کے بادشاہ کی مدح کرتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جس بادشاہ نے داستان گو کی سرپرستی کی ہے وہ اس کو کسی بھی جنگ میں شکست خوردہ کیسے دکھا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داستان کا ہیرو ہمیشہ فتح یاب ہوتا ہے۔ لیکن ہر داستان گو اس قصے کو ہو بہو بار بار دہرانا نہیں چاہتا اس لیے وہ اپنے قوت متخیلہ سے ہر داستان میں نیا رنگ وآہنگ پیدا کرتا ہے۔ جس کے لیے وہ مافوق الفطری عناصر سے کام لیتا ہے۔ اس طرح ہر داستان اپنے ایک خاص رنگ میں نظر آتی ہے۔ یہ داستانیں ادبی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں ہی ساتھ ہی ان میں ہمیں قدیم ہندوستانی تہذیبی وراثت کے عناصر بھی نظر آتے ہیں۔

’سب رس‘ اردو کی پہلی نثری داستان ہے جسے ملا وجہی نے 1635ء میں مکمل کیا۔ اسے نہ صرف پہلی نثری داستان ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ یہ اردو نثر کی پہلی ادبی تصنیف ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اردو کی پہلی تمثیلی تخلیق تسلیم کی جاتی ہے۔ یعنی یہ ایک تمثیلی داستان ہے۔ سب رس کا قصہ طبع زاد نہیں ہے۔ بلکہ اس کا بنیادی ماخذ سنسکرت ڈرامہ ”پربودھ چندرودئے“ (1065ء) از پنڈت کرشن مشر (بہاری) سے اخذ ہے۔ جسے پندرہویں صدی یعنی 1436ء میں فارسی کے مشہور ڈرامہ نگار محمد یحیٰی ابن سیبک فتاحی نیشاپوری نے فارسی زبان میں مثنوی کی شکل میں ”دستور عشاق“ کے عنوان سے لکھا اور بعد میں انھوں نے خود ہی اس کا نثری خلاصہ فارسی زبان میں ’قصہ حسن ودل‘ کے عنوان سے لکھا۔ ملا وجہی کی ’سب رس‘ کا تانا بانا اسی قصہ حسن ودل سے جا کر ملتا ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ وجہی نے قصہ حسن ودل کی ہو بہو نقل نہیں کی ہے بلکہ اکثر وبیشتر انھوں نے اپنے تخلیقی فن کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب رس کا قصہ روایتی نہیں ہے کیونکہ عزیز احمد نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ’سب رس‘ کا قصہ مختلف زبانوں میں موجود ہے بس فرق اتنا ہے کہ کہیں کہیں قصے میں ’آب حیات‘ کی تلاش ہے تو کہیں کسی قصے میں کسی ’پھول‘ کی تلاش ہے۔ بیشتر تحقیق کاروں نے ’قصہ حسن ودل‘ کو ہی سب رس کا ماخذ بتایا ہے لیکن جمیل جالبی اس سے جداگانہ نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ وجہی نے ’قصہ حسن ودل‘ سے استفادہ کیا ہو لیکن ان کا انداز بیان اس قدر مختلف ہے کہ ’سب رس‘ کا قصہ بالکل نیا اور طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔

’سب رس‘ کا تہذیبی مطالعہ کرنے سے قبل ادب اور تہذیب پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا بے حد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم سے ادب اور سماج کے رشتے پر بحث ہوتی رہی ہے۔ ارسطو سے لے کر ایلیٹ تک تمام فلسفیوں نے ادب کی سماجی وتہذیبی اہمیت پر زور دیا ہے۔ کسی بھی عہد کے مطالعے کے لیے اکثر وبیشتر ہم تاریخی کتابوں سے کام لیتے ہیں۔ تاریخی کتابوں میں سماجی، سیاسی، معاشی ومعاشرتی زندگی تو بخوبی دکھائی دیتی ہے لیکن جو صداقت ادبی سرمایہ میں موجود ہے وہ تاریخی کتابوں میں نہیں ہے۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک کے ادبی سرمایہ میں

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| 01-07 | ننھی کی نانی کا جائزہ<br>Dr (Mrs.) Zainaub Joomun: Lecturer, Department of Urdu Studies,School of Indian Studies, Mahatma Gandhi Institute, Moka, Mauritius | 1 |
| 08-14 | عمر خیام کی ادبی زندگی: ایک جائزہ<br>ڈاکٹر عقیلہ سید غوث: پرنسپل، آرٹس اینڈ کامرس مہاودیالیہ، امباجوگائی، بیڑ، مہاراشٹر۔ انڈیا | 2 |
| 15-20 | اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو میں نسائی مسائل<br>Dr Bibi Sakinah Rasmally Bahadoorr: Lecturer , Mahatma Gandhi Institute, Mauritius | 3 |
| 21-25 | فکر اقبال اور نوجوان نسل: تحقیقی مطالعہ<br>ڈاکٹر محمد عامر اقبال: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سیال کوٹ، سیال کوٹ، پنجاب۔ پاکستان<br>عبیدہ تسنیم: سینئیر سبجیکٹ سپیشلسٹ، گورنمنٹ گرلز ہائی سکینڈری سکول، باغ تحصیل و ضلع جھنگ۔ پاکستان | 4 |
| 26-37 | جموں و کشمیر کے غیر مسلم محبان اردو<br>ڈاکٹر مول راج: اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، ادمپور، جموں و کشمیر۔ انڈیا | 5 |
| 38-41 | مدحت پیغمبر ﷺ میں عشق رسول کے رنگ کا مطالعہ<br>ڈاکٹر بسمینہ سراج: صدر شعبہ اردو، شہید بینظیر بھٹو خواتین یونیورسٹی، پشاور۔ پاکستان | 6 |
| 42-48 | مجروح، مجبور اور مہجور کرداروں کا نمائندہ افسانہ نگار: اوم پرکاش والمیکی<br>ڈاکٹر متھن کمار: اسوسیٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ انڈیا | 7 |
| 49-53 | ہاشم ندیم کے ناولوں میں تصورِ عشق<br>پرویز احمد کمبوہ: لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ غلام ربانی ایگروڈگری کالج، کنڈیارو۔ پاکستان<br>محمد عارف پٹھان: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، جیکب آباد۔ پاکستان<br>ایاز علی جراح: لیکچرار، شعبہ اردو، شہید بے نظیر بھٹو یونیورسٹی، نواب شاہ۔ پاکستان | 8 |
| 54-58 | سلام مچھلی شہری: شخصیت اور شاعری<br>Dr. Hriday Bhanu Pratap:Assistant Professor,Department of Urdu,Zakir Husain Delhi College, University of Delhi- Delhi- India | 9 |

# سلامؔ مچھلی شہری: شخصیت اور شاعری

Dr. Hriday Bhanu Pratap

Assistant Professor,Department of Urdu,Zakir Husain Delhi College

University of Delhi- Delhi- India

سلامؔ مچھلی شہری کا شمار ترقی پسند عہد کے اہم شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو شیراز ہند جونپور کے قصبہ مچھلی شہر کے ایک متوسط علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ روایتاً اور والد محترم کی خواہش کے مطابق قرآن پاک بھی حفظ کیا۔ مڈل میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے سبب انہیں سرکاری وظیفہ سے بھی نوازہ گیا۔ آگے کی پڑھائی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انہیں فارس ہائی اسکول فیض آباد بھیجا گیا۔ جہاں سیاسی سرگرمیوں سے دلچسپی ہونے کے سبب ان کا رجحان تعلیم سے ہٹنے لگا، نتیجاً انھیں ہائی اسکول کے امتحان میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر انھوں نے میٹرک کے برابر کا دوسرا امتحان پاس کر کے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کی ملاقات دیگر ترقی پسند شعراء سے ہوئی اور ان کا انقلابی جذبہ پوری طرح ابھر کر سامنے آ گیا۔ انقلابی شاعری سے دلچسپی بڑھ جانے کے سبب ان کا تعلیمی سلسلہ یہاں بھی دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ شعر و شاعری کے مشغلہ کے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی میں لائبریری میں ملازمت کی، دو رسالوں 'نغمہ' اور 'مضراب' کے ایڈیٹر رہے، مزید اس کے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں اسکرپٹ رائٹر کی ذمہ داری بہ حسن و خوبی سنبھالی۔ ریڈیو میں ملازمت کے دوران وہ سری نگر اور دہلی بھی گئے۔ سلامؔ مچھلی شہری ۱۹ نومبر ۱۹۷۳ء کو دہلی میں اس جہاں سے کوچ کر گئے۔

اردو ادب میں سلام مچھلی شہری کو بحیثیت نظم نگار شہرت حاصل ہے۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'میرے نغمے' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ اوّل 'پھول' کے حصے میں رومانی نظمیں اور دوئم 'انگارے' کے حصے میں انقلابی نظمیں شامل تھیں۔ اس کا پہلا حصہ 'پھول' شائع ہو کر منظر عام پر آیا لیکن دوسرا حصہ 'انگارے' میں انقلابی مضامین ہونے کی سبب ضبط کر لیا گیا۔ ان کے اس مجموعے پر سرنامہ کے طور پر یہ شعر درج ہے ؎

میرے نغمے باغی بھی ہیں، میرے نغمے پیارے بھی
اب جس کا جو ذوق نظر ہو، پھول بھی ہیں انگارے بھی

ان کا دوسرا مجموعہ 'سعتیں' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں نئی اور پرانی دونوں طرح کی نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے گیتوں کے تین مجموعے 'پائل' 'بازو بند کھل جائے' اور 'تین ہیرے' شائع ہوئے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور ان کی غزلوں پر بھی انقلابی رنگ غالب ہے۔ سلامؔ کو منظوم نثر سے بہت دلچسپی تھی۔ لہٰذا ان کے ادبی سرمائے میں منظوم خطوط اور ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ان کے نثری کارناموں میں ریڈیائی ڈرامے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کی بے لوث ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند کی جانب سے ۱۹۷۳ء میں انھیں 'پدم شری' کے اعزاز سے نوازہ گیا۔

سلامؔ مچھلی شہری کی سرشت میں شعر گوئی کا ملکہ فطری تھا۔ ان کی پہلی نظم محض ۱۴ برس کی عمر میں 'نیرنگ خیال' میں شائع ہوئی۔ اس وقت وہ فیض آباد میں ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہیں پر ان کا ذہن سیاسی سرگرمیوں کی طرف مائل ہوا اور ان کا شاعرانہ جذبہ اپنے عروج پر آ گیا۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند شعراء کے خیالات سے خود کو محفوظ نہیں کر سکے۔ لکھنؤ کے تعلیمی دور میں ان کی ملاقات مجازؔ، ن۔م راشد اور شوکت تھانوی سے ہوئی۔ اس کے سبب ان کی زبان و بیان کی دلکشی اور نرمی و شگفتگی اور نزاکت و دل آویزی کو اور بھی پختگی حاصل ہو گئی۔ ان شعراء کے اثر سے ان کی سرشت میں انقلابی اور باغیانہ رویہ داخل ہو گیا۔ اس لیے وہ

بانی: بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: ۱۹۴۸ء

مدیرِ منتظم

سید عابد رضوی

قائم مقام مدیر

ڈاکٹر یاسمین سلطانہ فاروقی

مجلسِ مشاورت

پروفیسر ڈاکٹر شاداب احسانی

واجد جواد

فی پرچہ: ۱۵۰ روپے

سالانہ (صرف رجسٹری سے): ۲۰۰۰ روپے

(عام ڈاک سے): ۱۶۰۰ روپے

سالانہ (ہوائی ڈاک سے) ۵۰ پونڈ/۱۰۰ ڈالر

کتب ورسائل کی خریداری کے لیے منی آرڈر/بنک ڈرافٹ بنام
انجمن ترقی اردو پاکستان ارسال کیجیے۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق و تالیف و تصنیف

اُردو باغ، ایس ٹی۔۱۰، بلاک ۱، گلستان جوہر، کراچی

رابطہ: ۰۲۱-۳۴۱۶۱۱۴۳ شعبۂ فروخت: ۰۳۳۲-۲۷۹۰۸۴۳

atup.khi@gmail.com http://www.atup.org.pk

ڈاکٹر ثروت رضوی، مدیر قومی زبان نے داپرنٹ لنکس پریس، برنس روڈ کراچی، سے چھپوا کر انجمن ترقی اُردو سے شائع کیا۔

ڈاکٹر سفینہ ❁

# مولوی عبدالحق کے خوابوں کی تعبیر — ذاکر حسین دہلی کالج

مدرسہ غازی الدین حیدر، دہلی کالج، ذاکر حسین میموریل کالج، ذاکر حسین کالج سے ذاکر حسین دہلی کالج تک نے ہر دور میں اپنی سخت جانی کا لوہا منوایا ہے۔ دہلی اور دہلی کالج کی تاریخ پر اگر روشنی ڈالی جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں دہلی اور دہلی کالج ایک خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جیسے دہلی کئی بار اُجڑی اور بسی، اسی طرح دلّی کالج کو بھی اس امتحان سے گزرنا پڑا۔ دراصل آج ہم جس ذاکر حسین دہلی کالج کی بات کر رہے ہیں یہ مولوی عبدالحق کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ یہ دہلی کالج ہمارے بزرگوں کی محنت کا ثمرہ ہے۔ مولوی عبدالحق کو دہلی کالج سے بے حد لگاؤ تھا اور جب جب دہلی کالج کا ذکر آئے گا تب تب مولوی عبدالحق کا ذکر بھی آئے گا۔ یا یوں کہیے دہلی کالج کی تاریخ مولوی عبدالحق کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ مولوی عبدالحق نے دہلی کالج کی تاریخ اور بزرگوں کے کارنامے اپنی کتاب ''مرحوم دہلی کالج'' میں رقم کیے ہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے مالک رام قدیم دہلی کالج کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''آج کالج میں دہلی یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق ایم۔اے اور ایم۔ایس۔سی۔ تک کی تعلیم کا انتظام ہے ان کے پڑھانے کو ۱۷۵ اساتذہ مقرر ہیں اور غیر تدریسی اسٹاف کی تعداد ۱۰۵ ہے۔ دلّی کالج کی یہی خدمت اور اہمیت تھی جس کے باعث ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے ان کوائف پر مشتمل ایک سلسلۂ مضامین انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالے ''اُردو'' میں شائع کیا تھا۔ ان کا مجموعہ بعد میں ''مرحوم دہلی کالج'' کے عنوان سے کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ (دہلی ۱۹۴۵)۔ اس کے لکھتے وقت مولوی صاحب کے سامنے محکمۂ تعلیم کی سالانہ رپورٹیں اور کالج کی پرانی دستاویزیں تھیں۔'' (مالک رام، قدیم دلّی کالج، ص ۱۲)

مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب 'مرحوم دہلی کالج' میں دہلی کالج کی روداد بیان کی ہے تاکہ لوگ اپنے بزرگوں کے کارنامے ہمیشہ یاد رکھیں۔ اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے دہلی کالج کو مرحوم دہلی کالج ہی کیوں کہا، وہ اپنی کتاب کو قدیم دہلی کالج، رودادِ

❁ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی، ہندوستان

# سبق اردو

نومبر، ۲۰۲۱


ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: ڈاکٹر محمد سلیم | سرنامہ : عادل منصوری | جلد : ۶ | شمارہ : ۸

موبائل:9696486386 | سرورق : دانش الٰہ آبادی | Net Banking:SABAQ -E-URDU( MONTHLY)

واٹس ایپ:9919142411 | کمپوزنگ : دانش الٰہ آبادی، اہل قلم | IFSC BARB 0 GOPI BS A/C28240200000214

sabaqeurdu@gmail.com | مطبع: عظیم انڈیا پریس، گوپی گنج، بھدوہی | Bank of Baroda, Branch: Gopiganj

فی شمارہ: -/100، زرتعاون:-/1000 | زرتعاون خاص:-/2000، اعزازی تعاون:-/5000 | Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA



کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کی سنوائی صرف ضلع بھدوہی ہی کی عدالت میں ہوگی۔ ادارہ


## چیف ایڈیٹر — دانش الٰہ آبادی


| | | |
|---|---|---|
| ڈاکٹر محمد توحید خان | عصمت چغتائی کی شخصیت اور فکری تشکیل | ۴ |
| پروفیسر عزیز بانو | عہد بہمنیہ کی تاریخ کے فارسی مآخذ | ۱۳ |
| ڈاکٹر فیروز عالم | عصر حاضر کا کرب واضطراب اور سلام بن رزاق کا افسانہ ''گیت'': ایک تجزیاتی مطالعہ | ۱۶ |
| خیر النساء | علامہ اقبال بحیثیت غزل گو | ۱۹ |
| ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں | فارسی کے صوفی شعراء | ۲۰ |
| مسرت آرا | اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں تانیثیت: ایک جائزہ | ۲۳ |
| شائستہ عالم | غزال ضیغم کے افسانے اور ماضی کی بازدید | ۲۵ |
| محمد ضیاء المصطفیٰ | اردو صحافت کی مختصر تاریخ | ۲۷ |
| عذرا سہیل | پیتل کا گھنٹہ کل اور آج کے تناظر میں | ۳۰ |
| پھلیل سنگھ | ظہور الدین علمی وادبی خدمات کے آئینے میں | ۳۱ |
| سید محمد ظفر اقبال | لکھنوی تہذیب ومعاشرت کا عکاس: امراؤ جان ادا | ۳۴ |
| ڈاکٹر نصیر احمد ڈار | جنوبی کشمیر میں اُردو ادب کا آغاز وارتقا | ۳۶ |
| شازیہ پروین | تجلی علی شاہ: شخصیت اور علمی نقوش | ۳۸ |
| محمد خواجہ محی الدین | سوانح حیات مولانا محمد خواجہ شریف | ۴۰ |
| رمیص سلطان پوری | حنیف نقوی کا تحقیقی اسلوب | ۴۳ |

| | | |
|---|---|---|
| محمد جلیل اقبال خاکی | مشاعرے: امن کے نقیب اور ہندوستانی تہذیب کے عکاس | ۴۶ |
| ڈاکٹر ای۔ محمد انور حسین | مظہرالزماں کی افسانہ نگاری | ۴۸ |
| ڈاکٹر جگدمبا دوبے | اقبال مجید بحیثیت مضمون نگار | ۵۰ |
| صوفیہ | 'لالہ رخ' پر ایک نظر | ۵۲ |
| محمد موسیٰ | مولانا محمد عثمان فارقلیط کی صحافتی خدمات | ۵۵ |
| پریم پرکاش بھارتی | انیثیت کا مکمل اظہاریہ: نادیدہ بہاروں کے نشاں | ۵۷ |
| آسیہ یاسمین | شائستہ فاخری کے ناولوں میں تانیثی فکر کے بدلتے شعور | ۶۰ |
| میر راشد | ''نیاز فتح پوری کے افسانوں میں رومانیت اور سماجی حقیقت نگاری: ایک جائزہ'' | ۶۴ |
| ڈاکٹر نہال احمد انصاری | وحشت کلکتوی۔ فن و شخصیت | ۶۶ |
| سلیقہ جان | ''ولر کنارے'' کا تجزیاتی مطالعہ | ۷۰ |
| صدف نفیس | صلیبیں میرے دریچے میں: ایک تنقیدی محاکمہ | ۷۲ |
| ڈاکٹر جہاں گیر احمد خاں | قاضی عبدالغفار کی سیاسی سرگرمیاں | ۷۵ |
| گلزار احمد ڈار | اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش | ۷۷ |
| محمد محبوب | تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ۔ ایک جائزہ | ۸۰ |
| بشیر شاہین | پروفیسر گیان چند جین | ۸۴ |
| سعیدہ رخسانہ بیگم | ادب اور صحافت کا رشتہ اور ادبی صحافت | ۸۷ |
| شاہنواز عالم | ''راجندر سنگھ بیدی کا افسانوی امتیاز'' | ۸۸ |
| محمد یونس ٹھوکر | عمیرہ احمد کے ناولوں میں جدید مسلم معاشرے کے مسائل کی بوقلمونی | ۹۱ |
| ڈاکٹر شیخ عمران | مثنوی ''زہر عشق'' ایک جائزہ | ۹۳ |
| اظہر سراج | اُردو میں ترقی پسند ناول نگاروں کا مجموعی جائزہ | ۹۵ |
| عبدالواجد زرگر | ڈراما ''بھوک کے بھجن نہ ہوئے گوپالا'' ایک تنقیدی مطالعہ | ۹۹ |
| ڈاکٹر شکیلہ کے پی | سرسید احمد خان بحیثیت مضمون نگار | ۱۰۲ |
| ڈاکٹر سید کلیم اصغر | ''دور حاضر میں سید محمد کمال سنبھلی کے افکار کی اہمیت اسرار یہ کشف صوفیہ کے حوالے سے'' | ۱۰۴ |
| نفیس زہرا | اردو مراثی میں قومی یکجہتی کے عناصر | ۱۰۸ |
| ڈاکٹر سید کلیم اصغر | داستان کوتاہ 'خاک' کی انفرادیت | ۱۱۱ |
| ڈاکٹر ہردئے بھانو پرتاپ | داستان 'سب رس' کا تہذیبی مطالعہ | ۱۱۵ |
| اعلم شمس | عشق میر کی کائنات | ۱۱۸ |
| مہرین شفیع | فوزیہ نسیم مغل ضیاء بحیثیت شاعرہ | ۱۲۱ |
| ڈاکٹر محمد آصف ملک | جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں تصور محبوب | ۱۲۴ |
| رضیہ عائشہ جوائز | افسانہ ''کوآپریٹو سوسائٹی'' اور ہمارا معاشرہ | ۱۲۶ |

# عشقِ میر کی کائنات


## اعلم شمس


میر تقی میرؔ کی عظمت کو دنیا نے تسلیم کیا۔ میرؔ ہماری تہذیبی وراثت کا وہ حصہ ہیں جن کو بھلایا نہیں جاسکتا ہے وہ ہمارے تحت الشعور میں 'آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں' کی طرح رچ بس گئے ہیں۔ ان کے کلام کی تاثیر عالم گیر ہے۔ میر کی رسمِ عاشقی دوسروں سے ہٹ کر ہے۔ عشق اگر چہ خانہ آبادو خانہ برباد دونوں ہوتا ہے۔ لیکن میر کا عشق ہوسنا کی اور بولہوسی کا نہیں بلکہ تقدیس و تطہیر کا علم بردار ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی :''میر ہماری تہذیب کے ترجمان اور حسن کار ہیں۔ تہذیب رسم عاشقی کا فقرہ اور دعوا تو حسرت کا ہے لیکن میرے نزدیک اس کی روایت میرؔ سے شروع ہوتی ہے، میر اور حسرت کی تہذیب رسم عاشقی میں نمایاں فرق بھی ہے۔ میر کی زبان منفرد و ممتاز ہے۔'' [ کلیات میر، جلد اول۔ ص:25] میر کے یہاں حسن و عشق کی ہر تصویر بوقلمونی ہے، بلبل ہزار داستاں میرؔ کی شاعری کا ہر مصرع ہے۔ عشق کی ہمہ جہت تصویر کشی میرؔ کا خاصّہ ہے۔ غالبؔ نے عشق کے متعلق کہا تھا:

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یوں تو عشق و حسن کے تصور اور اس کے بیان کے بغیر اُردو شاعری کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے اور جس شاعر نے حسن و عشق کا تذکرہ جتنی خوبی سے کیا ہے وہ اتنا ہی بڑا ہے اس سلسلے میں غالبؔ کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن ہر جگہ موضوع کی طرح بیانِ عشق میں بھی میرؔ کا رقیب پیدا نہ ہوسکا۔ میر کا عشق پاکیزگی کی اس بلندی پر فائز ہے جہاں دیکھنے پر بڑوں کی ٹوپیاں گر جاتی ہیں، میر کہتے ہیں:

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

محبوب کی گلی میں چکر لگانا تو دور، گلی میں لاش کو لیے پھرنا بھی نہیں بلکہ خاک ہوکر بھی محبوب اور اس کے گھر سے دور بیٹھنا ہی پاسِ عشق ہے۔ میر نے کہا کہ:

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

گویا کہنا چاہ رہے ہوں کہ میرے اشعار زمانے کے دلوں کو کیوں کھینچتے ہیں جب کہ نہ تو میری طرز ایسی ہے اور نہ ہی ایہام گوئی کا فن۔ اس تجاہل عارفانہ کے بعد دوسری جگہ اس کا حل بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ دراصل یہ سب عشق کی وجہ سے ہے۔ کہتے ہیں:

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنی
اس خاک رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

ایک طرف غالبؔ عشق کو رقیبِ سروساماں سمجھتے ہیں، کہتے ہیں:

شوق، ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

جب کہ میرؔ مثنوی 'شعلۂ عشق' میں کہتے ہیں:

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت اگر کارِ پرواز ہو
دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو

میرؔ ایک عاشق صادق ہیں، ان کے عشق کی آواز ان کی شاعری ہے اور کیوں نہ ہو جب خود اُن کے صوفی والد نے اُنھیں عشق کی تعلیم دی۔ بقول والدِ میر:

''بیٹا عشق کرو عشق ہی اس کارخانے میں متصرف ہے اگر عشق نہ ہوتا تو نظم کل قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ بے عشق زندگی وبال ہے عشق میں جی کی بازی لگا دینا کمال ہے۔ عشق بناتا ہے عشق ہی کندن کر دیتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ عشق کا ظہور ہے۔ آگ عشق کی سوزش ہے، پانی عشق کی رفتار ہے، خاک عشق کا قرار ہے، ہوا اس کا اضطرار ہے، موت عشق کی مستی، زندگی عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب اور دن عشق کی بیداری، مسلمان عق کا جمال، کافر عشق کا جلال ہے، نیکی عشق کا قرب ہے، گناہ عشق کی دوری، جنت عشق کا شوق ہے، دوزخ عشق کا ذوق ہے، عشق کا مقام عبودیت و صارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلوصیت، مشاقیت و خلیت و حبیبیت سے بہت بلند ہے۔'' (کلیات میر۔ جلد اول۔ ص:60)

یہ اسی تعلیم کی وجہ تھی کہ میرؔ کو ذرے ذرے میں عشق نظر آنے لگا، ان کے یہاں عشق ساری کائنات پر حاوی ہوجاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

عشق ہی عشق جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

میرؔ کے نزدیک عشق خالقِ عشقِ خلق ہے اور عشق ہی باعث ایجادِ خلق

سہ ماہی دہلی

# تاریخ ادب اردو

اردو ادب کا نقیب و ترجمان

جلد:۳ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱) شمارہ:۴

سرپرست اعلیٰ: ارتضٰی کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر واثق الخیر ایسوسی ایٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد بہلول

خط و کتابت/ترسیل وزر کا پتہ

سہ ماہی تاریخ ادب اردو دہلی، ۲۴۹۶، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷

2496, 2nd Floor, Punjabi Basti, Sabji Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-07

E-mail:editorurdu@gmail.com

website:tareekheadabeurdu.com

Mobile No.:+91-9968244001

اس شمارہ کے مشمولات سے مدیر/وابستگان کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی تحریر/اقتباس کے لیے مضمون نگار خود ذمہ دار ہے۔ ''تاریخِ ادب اردو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حقِ سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہوگا۔

**سرپرست:**

ڈاکٹر راکیش کمار پانڈے ☆ پروفیسر رئیس انور رحمٰن ☆ پروفیسر محمد رضی الرحمٰن

ڈاکٹر پرمود کمار بھارتی ☆ پروفیسر کوثر مظہری

## مجلس مشاورت

**بیرون ملک:**

پروفیسر یوسف خشک (پاکستان)، پروفیسر ضیا حسن (پاکستان)، ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی (پاکستان)، ڈاکٹر سمیرا بشیر (پاکستان)، پروفیسر ثمینہ گُل (پاکستان)، پروفیسر احمد القاضی (مصر)، پروفیسر حلیل طوقار (ترکی)، پروفیسر اسومان اوذکین (ترکی)، پروفیسر دُرمُش بُلگر (ترکی)، ڈاکٹر ذکائی کارداس (ترکی)، فرزانہ اعظم لطفی (ایران)، ڈاکٹر علی بیات (ایران)، ڈاکٹر محمد کیومُرسی (ایران)

**اندرون ملک:**

پروفیسر خالد اشرف، ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر نوشاد مومن، ڈاکٹر دانش الہ آبادی، ڈاکٹر مجیب احمد خان، پروفیسر آلِ ظفر، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر افروز عالم، ڈاکٹر محمد داؤد محسن، ڈاکٹر رحمٰن اختر، ڈاکٹر شاہد رزمی، ڈاکٹر متھن کمار، ڈاکٹر بلرام شکلا، رضوان ندوی، ہاجرہ نور، احمد زریاب۔

**قانونی مشیر:** ایڈوکیٹ انل کمار سنگھ، ایڈوکیٹ سیما سنگھ

زر تعاون:

| | |
|---|---|
| فی شمارہ-/50 | خصوصی شمارہ-/200 |
| سالانہ-/1000 | خصوصی تعاون-/5000 |

A/C Name:- PEACE INDIA FOUNDATION

A/C No.:- 51521131001918

IFSC:- PUNB515210

~~مالک، طابع و ناشر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا نے جے کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس، سے چھپوا کر دفتر ''تاریخ ادب اردو''~~

۲۴۹۶، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷ سے شائع کیا۔

# فہرست

اداریہ:

ناصر ملک: رنگین دنیا کا ایک گمنام شاعر — ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

نظیر اکبر آبادی کی شاعری — اعلم شمس

''اردو'' اور ''ڈھونڈھاری'' — مصور احمد

عہد وسطیٰ میں عورت کی حیثیت — شبنم آرا

سائنسی فکشن مائکرو فکشن کے خصوصی حوالے سے — غلام مصطفےٰ

جنوبی کشمیر میں ایک سنجیدہ شاعر: شوریدہ کاشمیری — ڈاکٹر نصیر احمد ڈار

عصر حاضر میں کشمیر میں فارسی ادب کی اہمیت — ڈاکٹر احمد وانی

جموں وکشمیر میں آزادی کے بعد اردو صحافت — ڈاکٹر نصرت بانو

اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں سماجی واخلاقی مسائل کی عکاس — ڈاکٹر تسنیمہ پروین

فیض احمد فیض — ڈاکٹر مجاہد الاسلام

مولانا ابوالکلام آزاد کی دینی خدمات — ڈاکٹر واثق الخیر

روفیدہ الاسلمیہ عصر جدید کی مسلم خواتین — ڈاکٹر علی محمد بٹ

ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط — راشد قادری

شاہ نصیر دہلوی حیات اور فکر وفن — محمد پرویز بونیری

شہزاد بسمل کی افسانہ نگاری ''رقص بسمل'' کے حوالے سے — صبا حسن جان

ہندوستان میں فارسی تاریخ نگاری کا آغاز وارتقاء — ڈاکٹر شہناز بیگم

جموں وکشمیر اور اردو افسانے کے شارحین — ڈاکٹر فیاض احمد ڈار

کشمیر میں دین اسلام کے مبلغ میر سید علی ہمدانی — مبارکہ موسوی

# نظیر اکبرآبادی کی شاعری

اعلم شمس
اسسٹنٹ پروفیسر، ذاکر حسین کالج،
دہلی یونیورسٹی

نظیر دہلی میں 1735 میں پیدا ہوئے اور نادر شاہ کے حملے کے وقت وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنی نانی کے یہاں آگرہ آگئے تھے۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز، مخمور اکبرآبادی، مولانا عبدالباری، مولانا اشرف لکھنوی، فرحت اللہ بیگ، پروفیسر محمد حسن اور ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ نظیر اپنی ماں کے ساتھ 23-22 سال کی عمر میں آگرہ آئے جب کہ یہ غلط ہے۔ قطب الدین باطن جو نظیر کے شاگرد تھے، انھوں نے اپنے تذکرہ 'گلستانِ بےخزاں' میں لکھا ہے کہ نظیر صغرسنی میں اپنی والدہ کے ساتھ آگرہ گئے۔ باطن کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ وہ نظیر کے شاگرد تھے پھر اگر نظیر جوانی میں دلّی چھوڑتے تو ان کی شاعری میں دلّی کی زبان، دلّی کے حالات کچھ تو ان کی شاعری میں ہوتا کیوں کہ بچپن کے نقوش بہت گہرے ہوتے ہیں۔

نظیر آگرے میں نوری دروازے میں رہتے تھے۔ گلزار علی اور امامی بیگم دو بچے تھے۔ نظیر کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ نظیر نے اپنی جوانی میں زندگی کے عیش و آرام، تفریح اور مذاق سب میں حصہ لیا تھا۔ کھیل کود، کنکوئے بازی، تیراکی، کشرت، کشتی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، غرض کہ ہر طرح کا مزا لیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے تہواروں میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ بڑے بڑے دعوت نامے انھیں آگرے سے دور نہ لے جا سکے۔ انھیں آگرے

# علی گڑھ اِنسٹی ٹیوٹ گزٹ کی سماجی خدمات!

ڈاکٹر محمد معین الدین

تاریخ کے صفحات میں یہ فقرہ زریں حروف میں مرقوم ہے:

''قوت ہار جاتی ہے اور جذبے جیت جاتے ہیں!''

ایسا ہی کچھ اس وقت ہوا جب 1857 کی جنگ آزادی کی مزاحمت اور اس کے نتیجے میں انگریزی قوت کا نظارہ تاریخ نے دیکھا۔ اقوام ہند بالخصوص مسلمان ظلم وجبر کی چکی میں پس رہے تھے، ان کا حال تباہ تھا اور مستقبل بھی تاریک تھا۔ اس وقت ایک مسیحا نے ان کی مسیحائی کی اور جذبۂ عمل سے انگریزی قوت کی مشینری کے کل پُرزے ناکارہ کردیے۔ اس مسیحا کا نام سرسید احمد خان [1817-1898] ہے، قوم نے اُس مسیحا کی مسیحائی کا ملا جلا اثر قبول کیا۔ یعنی قوم کے کچھ افراد نے ان کی مخالفت بھی شروع کردی۔ تاہم انھوں نے ان کی مخالفت کی پروا کیے بغیر اپنے مشن اور مقاصد کو ہی ملحوظ خاطر رکھا۔ انھوں نے ظلم وجور کی چکی میں پستے ہوئے مسلمانوں کو راہ نجات دکھائی۔ اُن کی عظمت رفتہ اور اُن کے بخت خفتہ کو بیدار کرنے کے لیے جہاں اُس مسیحا نے اُنھیں انگریزی سیکھنے اور انگریزوں کا علم کے بل بوتے پر مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔ اس مسیحا نے تحریکِ آزادی کو ایک نیا رنگ اور آہنگ دیا۔ اس تحریک میں مقصدیت کارفرما تھی۔ تحریک کے پس منظر میں جذبہ حریت وانسانیت کارفرما تھا۔ چنانچہ جذبوں سے سرشار مسلمانوں نے اس مسیحا کی قیادت میں تحریک آزادی کا راستہ ہموار کرنے کے لیے سر سے کفن باندھ لیا۔

تاریخی اعتبار سے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ 1857 کا سانحہ ہندستان میں سماجی، معاشرتی، تمدنی، عمرانی، اقتصادی، سیاسی غرض ہر سطح اور جہت کے اعتبار سے ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔ اس موڑ سے زندگیاں گزرانے اور مقاصد زندگی حاصل کرنے کے طریقے، دنیا میں رہن سہن کے سلیقے، پیش آمدہ حالات وواقعات کو روایتی طریقے سے دیکھنے کے بجائے غیر روایتی طریقے سے دیکھنے کا ہنر اور لمحاتی تحریک پر دور اندیشی ودور بینی کا شعور بھی آگیا۔ اسی طرح اس سانحے کے بعد اقوام مشرق کے سب سے بڑے دیار ہندستان میں انقلابات، بیداری، ہوش مندی اور شہر یاری کے افکار وخیالات کے سودے دماغوں میں سمانے لگے۔ ایک لہر سی تن ہائے مردہ میں دوڑگئی اور ناکارہ انسان، وجود، احساس، عقل ودماغ فعال ہوگئے۔ علاوہ ازیں چند مخصوص طبقات کو چھوڑ کر عمومی افراد اور طبقات اب نئے انداز ومناہج سے زندگی گزارنے اور پنپنے کے اصول و ضوابط ترتیب دے رہے تھے۔ یوں مشرق ومغرب میں ان کے دَور کا آغاز ہوگیا۔ اس کارواں کے قائدین اس عہد کے عالی دماغ اور قومیت کے جذبے سے سرشار افراد تھے جنھوں نے اس بدلتی ہوئی صورت حال میں اپنی قوم کو مناسب راہ نمائی کی اور انھیں کامیابی کی راہوں پر گام زن کردیا۔ محسن ملت سرسید احمد خاں، اکبر الہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، حالی، شبلی، مولانا آزاد، مذہبی وملّی رہ نما اور ملت کے دیگر بہی خواہوں نے وطن اور قوم کی بھلائی وخیر کی ترسیل میں کسی طور پہلوتہی نہیں برتی۔ بالخصوص سرسید احمد خاں نے جو کارنامے انجام دیے ان کی نظیر نہ تو ان سے قبل کی صدیوں میں ملتی ہے اور نا مابعد ہی۔ ایک تاریخ انھوں نے رقم کی اور دعوت عمل وفکر کے میدان میں اَن مٹ نقوش چھوڑے۔

سرسید کے ان کارناموں کی عظمت کا اعتراف نہ کرنا احسان فراموشی وناسپاسی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان غیر معمولی کارناموں نے 19ویں صدی کے نصف آخر میں مایوسی ونامرادی، اندھیرے اور جہالت میں غرق اور پرآشوب وپرخطر حالات میں مسلم قوم کی دست گیری کی اور بیمار ونحیف معاشرے میں زندگانی کی روح پھونکی۔ اُداسیوں کے خراب موسم کو فرحت وانبساط کے خوش گوار موسم میں تبدیل کیا۔ ناامیدیوں کے دَور میں امید وحوصلے کی امنگیں جگائیں اور بے سمت راہوں میں بھٹکتے کاروانوں کو سمت منزل بتائی۔ مختصر یہ کہ سرسید احمد خاں میں سماجی خدمات کا ایک ناقابل تسخیر ولولہ اور عزم موجزن تھا، جس نے انھیں تاعمر مضطرب رکھا اور انھیں یہ شاہ کارنامے انجام دینے پر مہمیز کیا۔

سرسید احمد خاں کے ملی وقومی، سماجی ومعاشرتی کارناموں میں 'سائنٹی فک سوسائٹی کا قیام'، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تشکیل، اسی طرح علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کا اجرا، نیز خطبات احمدیہ وغیرہ کتب کی اشاعت ہے جن کے ذریعے انھوں نے جہاں تعلیمی، مذہبی اور فکری خیالات کی ترویج کی وہیں اُن کے ترجمان جریدوں [علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق] نے سماجی خدمات کی انجام دہی میں نمایاں کردار ادا کیے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سائنٹی فک سوسائٹی کا ترجمان تھا۔ جس کا اجرا 30 مارچ 1866 میں عمل میں آیا۔ جس کے گوناگوں مقاصد تھے۔ سامراجی حکمرانوں تک نے دبے کچلے ہندستانی عوام کی آواز پہنچانا، سرکار اور عوام کے درمیان پھیلی غلط فہمیوں کا ازالہ، آزادی کا صحیح تصور اور مطالبہ، اسی طرح شمالی ہند میں علم فضا قائم کرنے اور مسلمانوں میں اعتماد کی بحالی وغیرہ تھے۔ چنانچہ ان احساسات وافکار کو بدلتے حالات سے ہم آہنگ کرنے اور انھیں جلا بخشنے کے لیے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے نہایت پابندی سے مسلسل 32 برسوں تک